نگار

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰/

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ چھ آنے (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی بہ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر نہایت بلند انشاء اور پُرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) لقمان (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز

پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا شہوانیات (مجلد)

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز ہر مذاہب عالم نے اس کے رواج میں مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت ڈیڑھ روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۶ء

خُدا نمبر

وجود باری کے تصور و عقیدہ سے کبھی کوئی زمانہ خالی نہیں گزرا۔ کسی نہ کسی صورت میں وہ اسی وقت سے چلا آرہا ہے جب انسان نے دُنیا میں آنکھ کھولی اور ذہنی و تمدنی تبدیلیوں کے ساتھ اس تصور میں بھی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ پھر غور کیجئے کہ عہدِ تاریخ سے پہلے اور اس کے بعد انسان پر کتنے دور گزر چکے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ روئے زمین کے بسنے والوں میں جغرافی و تمدنی ماحول اور تجربات کی بنا پر معلوم نہیں کتنی ذہنی تبدیلیاں ہوئی ہوں گی اور ان تبدیلیوں کا اثر اس کے عقاید پر نہ جانے کتنی عجیب و غریب صورتوں میں ہوا ہوگا۔

انسان نے شجر و حجر کی پرستش کی، وحوش و بہایم کے سامنے گردن جھکائی، عناصر و موسم کی پوجا کی، مظاہر طبیعی کے سامنے سر جھکایا، اپنے ابناء جنس کو اپنا معبود قرار دیا اور اس طرح کتبات و مخطوطات، نقوش و تصاویر، دُعاؤں اور بھجنوں کی صورت میں اپنے تاثرات کا وہ ایک بڑا ریکارڈ اپنے بعد چھوڑ گیا۔

پھر جب دورِ تعقل شروع ہوا اور اس نے مظاہر و آثارِ فطرت کا مطالعہ عقل و فراست کی روشنی میں کیا تو ایک طرف ترقی یافتہ مذاہب، حکمت و فلسفہ اور تصوف وجود میں آئے اور دوسری طرف مادہ و قوت کے نظریہ نے الحاد اور خدا سے جحود و انکار کی بنیاد ڈالی، یہاں تک کہ دورِ حاضر میں بھی جو عقلی موشگافیوں کا بڑا ترقی یافتہ دور سمجھا جاتا ہے یہ معمہ آج تک حل نہ ہوسکا کہ خدا ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا صحیح تصور کیا ہوسکتا ہے۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اظہار بیدلؔ نے اس طرح کیا ہے:

بیدلؔ آں گوہر نایاب سراغ، — بہ محیطے ست کہ پرسیدن نیست
عکس افتادہ در آئینۂ ہوش — گل تواں گفت و لے چیدن نیست
نسخہ ہا در بغل و فہم محال، — جلوہ ہا در نظر و دیدن نیست

خُدا کے باب میں انھیں تمام صنمیاتی، تاریخی، مذہبی، اخلاقی و عقلی ادوار کی تاریخ

سالنامہ نگار ۱۹۵۶ء ہوگا

جس سے خدا کی حقیقت سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن انسانی نارسائیوں کی داستان ضرور سامنے آجائے گی۔ یہ کام اس میں شک نہیں بہت بڑا ہے، بہت مشکل ہے لیکن ہو۔

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مُرسٰہا

نیاز۔ ۲۰ فروری ۱۹۵۵ء

سالنامہ ۱۹۵۵ء علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر کا تتمہ

نگار جولائی ۱۹۵۵ء کے ساتھ شایع ہوگا

سالنامہ ۱۹۵۵ء میں گنجایش نہ ہونے کی وجہ سے تقریباً ۲۵ اعلماء و مشاہیر کا حال درج ہونے سے رہ گیا تھا جسے اب جولائی ۱۹۵۵ء میں اس طرح دیا جائے گا کہ آپ اسے علٰحدہ کرکے سالنامہ میں شامل کرلیں۔ اس لئے وہ حضرات جن کے پاس سالنامہ ۱۹۵۵ء موجود ہے وہ جولائی ۱۹۵۵ء نگار کو ضرور حاصل کرلیں۔

منیجر

سالنامہ کو ذریعہ رجسٹری روانہ کرنے کے لئے

ہر سال ہم کو چھ آنے طلب کرنا پڑتے ہیں

اور جو حضرات ذریعہ رجسٹری طلب نہیں کرتے ان میں سے بعض کا سالنامہ گم ہو جاتا ہے جس کا ہم کو سخت افسوس ہوتا ہے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ مصارف رجسٹری سالانہ چندہ کے ساتھ ہی وصول کر لئے جائیں اور خریدارانِ نگار کو دوبارہ چھ آنے بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کرنا پڑے۔

پھر یا تو آپ ذریعہ منی آرڈر سالانہ چندہ آٹھ روپیہ چھ آنے روانہ فرمائیے یا آٹھ روپیہ آٹھ آنے کے بجائے آٹھ روپیہ چودہ آنے کا وی۔ پی قبول کیجئے۔ منیجر

چند نایاب کتابیں

آثار الصنادید (سرسید) ـــ قاموس المشاہیر ۲ حصے (نظامی بدایونی) ـــ تذکرۂ آبحیات (آزاد) ـــ
۲۵ء ۲۰ء ۱۰ء

مرقع چغتائی ۲۸ء ـــ کلیات نظیر و سوانح عمری نظیر (پروفیسر شہباز) ـــ مطلع العلوم و مجمع الفنون (واجد علی) ـــ
۶۰ء ۳۰ء ۱۰ء

تنقیح اللغات (جلال لکھنوی) ـــ بحر الفصاحت (عروض و قوافی) نجم الغنی ـــ مخزن نکات (تذکرہ قدیم) ـــ چمنستان شعراء (تذکرہ)
۴ء ۳ء ۴ء ۱۵ء

منتخب کلیات ظفر (بہادر شاہ ظفر) ـــ کلیات نظم و نثر سعدی (شیخ مصلح الدین سعدی) ـــ دریائے لطافت (میر انشاء اللہ خاں) ـــ
۳ء ۱۰ء ۱۰ء

فسانۂ عجائب (مرزا رجب علی بیگ سرور) ـــ شگوفۂ محبت حصۂ دوم فسانۂ عجائب (مرزا رجب علی بیگ سرور) ـــ احیاء العلوم (مذاق العارفین اردو) مترجم محمد حسین
۳ء ۲ء ۵ء

کیمیائے سعادت فارسی - (امام محمد غزالی) ـــ وقایع سیر و سیاحت (ڈاکٹر برنیر در عہد در عہد شاہ جہاں و اورنگ زیب) مترجم محمد حسین ـــ
۸ء ۲۵ء

سفر نامہ شیخ ابن بطوطہ (ترجمہ نوازش علی خاں اردو) ـــ تاریخ سلاطین فاطمیہ (ذاکر حسین) ـــ تاریخ فرخ آباد ہر دو حصہ (مسٹر ولیم آروان صاحب)
۵ء ۵ء ۱۲ء

تاریخ شمس التواریخ جلد دوم - (نواب علی صاحب - تاریخ اودھ) ـــ غیاث اللغات (مطبوعہ) ـــ منتخب اللغات (مطبوعہ بمبئی)
۴ء ۱۵ء ۴ء

منتخب لغات عثمانیہ - (فارسی و ترکی و عربی) ـــ کشف اللغات (عبدالرحیم - ۲ حصے) ـــ
۲۰ء ۲۵ء

لغت اردو و فارسی سے انگریزی (اول و آخر صفحات پر شاہانِ اودھ کی مہریں) ـــ فرہنگ جہانگیری (جمال الدین حسین)
۱۵ء ۲۰ء

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ مارچ میں ختم ہوگا اور اپریل کا
"نگار" آٹھ روپیہ چودہ آنے میں وی۔پی ہوگا جس میں نگار سالنامہ ۱۹۵۶ء کی قیمت بلا مع معارف (جنتری) بھی شامل ہے۔

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۶ | فہرست مضامین مارچ ۱۹۵۵ء | شمار ۳

ملاحظات ---------- ۳
عہدِ بنی امیہ کا مالیاتی و ثقافتی نظام ---------- ۵
جوشؔ ملیح آبادی ---------- خلیل الرحمان اعظمی ---------- ۹
خدائی (نظم) ---------- فضا ابن فیضی ---------- ۱۷
فنِ تحریر کی تاریخ ---------- محمد اسحاق صدیقی ---------- ۱۸
شعلۂ ندا ---------- ارشد کاکوی ---------- ۲۵
تقدیر اور گردشِ کواکب ---------- ۳۰
شیفتہ کی داستانِ عشق ---------- عابد علی عابد ---------- ۳۴
مشاعرۂ نگار ---------- ۳۷
دُنیا کی خاص خاص حکومتیں ---------- ۴۳
کچھ زمین کے بارہ میں ---------- ۴۴
مطبوعات موصولہ ---------- ۴۷ — ۵۲

ملاحظات

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پر گہر ہونے تک

اس وقت پاکستان کے سیاسی حالات میں اس قدر جلد جلد تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں کہ آیندہ کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم کرنا بہت دشوار ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دستور بنتے بنتے وہاں اور کیا انقلابات رونما ہونے والے ہیں

پاکستان کی سیاست میں سب سے پہلی اہم تبدیلی اس وقت ہوئی جب مسٹر غلام محمد نے وہاں کی اقتصادی بے چینیاں دور کرنے کے لئے خواجہ ناظم الدین کو ہٹا کر عنانِ حکومت مسٹر محمد علی کے ہاتھ میں دی اور وقتی طور پر پاکستان کے اندرونی اقتصادی اضطراب کو دور کرنے کے لئے منجملہ دیگر تدابیر کے ہندوستان کے ساتھ بھی بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن چونکہ پاکستان کی پالیسی کا انحصار یکسر مسلم لیگ کی قوت پر تھا اس لئے مسلم لیگ کی نامقبولیت کے ساتھ ساتھ محمد علی وزارت کی ساکھ بھی مٹنے لگی، یہاں تک کہ جب مشرقی بنگال کے انتخابات میں اس کو فاش شکست ہوئی اور پاکستان کے دونوں حصّوں میں تعلقات کی کشیدگی بہت بڑھ گئی تو گورنر جنرل پاکستان نے (جن سے محمد علی کے تعلقات اب خوشگوار نہ رہ گئے تھے) دوسرا قدم اُٹھایا اور محمد علی کی قوت توڑنے کے لئے یہاں کی بساط سیاست سے پرانے مُہرے ہٹا کر، چند نئے مُہرے بٹھا دئے، جن میں اسکندر مرزا اور محمد ایوب خاں خاص اہمیت رکھتے تھے

اتفاق سے اسی زمانہ میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان فوجی امداد کا مسئلہ بھی طے ہو گیا اور ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی کابینہ میں تازہ ردوبدل کا ایک سبب یہ بھی ہو، بہرحال اسباب جو کچھ بھی ہوں، پاکستان کا یہ آخری انقلاب یقیناً نیم عسکری قسم کا تھا اور ایسی صورت میں جبکہ مقننہ و عاملہ عوام کی صحیح نمایندگی سے خالی ہو، کوئی دستور سامنے نہ ہو، ملک کی مختلف جماعتوں کے اختلاف نے نظم حکومت میں اختلال پیدا کر رکھا ہو اور ملک کے مختلف صوبوں کا نصب العین

مختلف ہو، ہمیشہ عسکری حکومت ہی سے کام چلتا ہے اور بحالات موجودہ پاکستان کے لئے بھی یہی مناسب تھا کہ وہ اس نوع کی آمرانہ حکومت کا سہارا لیتا، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ کابینہ میں تازہ تبدیلی کے بعد سیاسی نقطۂ نظر میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی جس کا نمایاں ثبوت نہ صرف اسکندر مرزا اور مسٹر غلام محمد بلکہ خود محمد علی کے وہ بیانات ہیں جن میں ہندوستان کے ساتھ بہتر تعلقات قایم کرنے کا قوی رجحان پایا جاتا ہے، حالانکہ یہ محمد علی وہی ہیں جو اس سے قبل امریکہ کی عسکری امداد کی توقع پر یہ طفلانہ و سفیانہ خیال ظاہر کرنے سے باز نہ رہ سکے تھے کہ "اب کشمیر کے مسئلہ کو ہم آسانی سے طے کر سکیں گے"۔

حالات کی نوعیت یہ تھی کہ دفعتاً یہ خبر سننے میں آئی کہ سندھ چیف کورٹ نے مسٹر غلام محمد کے احکام کے خلاف تمیز الدین صاحب کی درخواست مرافعہ کو منظور کر کے گورنر جنرل کے احکام کو ناجایز قرار دیدیا ہے اور اب حکومت نے فیڈرل عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کی ہے۔

اس اپیل کا نتیجہ کیا ہوگا، اس کی بابت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن گمان غالب یہی ہے کہ فیڈرل کورٹ، سندھ چیف کورٹ کے فیصلہ کو مسترد نہ کرے گا اور یقیناً پاکستان کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوگا، کیونکہ اگر اس فیصلہ کی پابندی کی گئی تو پھر وہی کابینہ لوٹ آئے گی جو پہلے کام کر رہی تھی اور موجودہ کابینہ کے اکثر ارکان کو ہٹ جانا پڑے گا۔

کراچی کی بعض اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر صورت ایسی پیدا ہوئی تو مسٹر غلام محمد استعفا دیدیں گے اور ان کی خودداری کا تقاضہ یقیناً یہی ہونا چاہئے، لیکن اگر یہ نہ ہوا اور مسٹر غلام محمد نے ضرورت و مصلحت کو سامنے رکھ کر پھر جرأت سے کام لیا تو یہاں عسکری حکومت قایم ہو جائے گی اور اسکی باگ اسکندر مرزا اور جنرل محمد ایوب خاں کے ہاتھ میں ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ انکل سام کا بھی یہی مشورہ ہو اور یہ مشورہ پاکستان کی موجودہ حکومت کے لئے بڑا زبردست سہارا ہو سکتا ہے۔

یقیناً کسی ملک میں فوجی حکومت کا قیام کوئی قابل ستایش امر نہیں ہے، لیکن جب ملک کی مختلف جماعتوں کی کشاکش نظم و نسق کو معطل کرنے کی حد تک پہونچ جائے تو پھر اس کے سوا کوئی دوسرا چارہ بھی نہیں۔

بہر حال یہ حالات موجودہ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ آیندہ پاکستان میں کیا ہونا ہے اور دستور بنتے بنتے اسے اور کتنی دشوار منزلوں سے گزرنا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر مسٹر غلام محمد ہٹ گئے اور موجودہ کابینہ ختم ہو گئی جس کی توقع بہت کم ہے تو ہندوستان و پاکستان کے درمیان پھر ناگواری کی صورت پیدا ہو جائے گی جسے پاکستان کی عام آبادی غالباً اب گوارا نہ کرے۔

۲۵ مارچ ۵۵ء

اس وقت ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں کی آبادی ۲۵ مارچ کا بے چینی سے انتظار کر رہی ہے جب وزیر اعظم پاکستان مسئلہ کشمیر پر مسٹر نہرو سے اک مختتم گفتگو کرنے کے لئے دہلی آئیں گے۔

کشمیر کا مسئلہ بہت الجھا ہوا ہے اور اس کا سلجھنا آسان نہیں ہے اگر پاکستان و ہندوستان دونوں رواداری سے کام نہ لیں اور اپنے شرائط و مطالبات میں کچھ ترمیم نہ کریں یہ بات اصولاً مان لی گئی ہے کہ یہ فیصلہ صرف اہل کشمیر کی رائے پر منحصر ہے، لیکن سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی صحیح رائے معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔

پاکستان کو یہ خوف ہے کہ ہندوستان اہل کشمیر کی آزادانہ رائے معلوم کرنے میں ہندوستان ہر قسم کے موانع حایل کرے گا اور ہندوستان کو یہ ڈر ہے کہ باوجود ان تمام مراعات و فواید کے جو اس وقت تک کشمیر کو ہندوستان کی طرف سے حاصل ہو چکے ہیں وہاں کی مسلم اکثریت شمول پاکستان کے حق میں رائے دے گی اور جب تک دونوں کی یہ ذہنی الجھن دور نہ ہو اس گتھی کا سلجھنا بہت مشکل ہے۔

اس سے قبل مسٹر نہرو نے اس دشواری کا یہ حل نکالا تھا کہ رائے شماری کسی ایسی چھوٹی حکومت کے نامزد کردہ شخص کے زیر نگرانی ہو جو اقتصادی یا سیاسی حیثیت سے کوئی دلچسپی کشمیر سے نہ رکھتی ہو اور یہ بڑی مناسب رائے تھی لیکن پاکستان نے اس کو اہمیت نہ دی تھی، اب اگر پاکستان نے اس کو تسلیم کر لیا تو ایک بڑا سنگ گراں راستہ سے ہٹ جائے گا۔ اس کے بعد دوسری شرط غالباً فوجوں کے ہٹائے جانے کی ہوگی اور پاکستان اسے مان لے گا لیکن ایک تیسری چیز اور ہے کشمیر کی موجودہ حکومت اور پاکستان یقیناً چاہے گا کہ رائے شماری کے دوران میں اس کو معطل کر دیا جائے تاکہ وہ لوگوں پر اپنا اثر نہ ڈال سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہی وہ چیز ہے جو اس گفتگو کو مکمل نہ ہونے دے گی اور یہ مسئلہ پھر ملتوی ہو جائے گا۔ بہر حال ۲۵ مارچ بڑی اہم و فیصلہ کن تاریخ ہے جس کا ہندوستان و پاکستان دونوں ملکوں کی آبادی کو سخت انتظار ہے اور نتیجہ کی طرف سے مایوس نہیں ہیں۔

عہدِ بنی اُمیہ کا مالیاتی و ثقافتی نظام

سالنامہ ۵۵ء (علماء اسلام نمبر) کی ترتیب کے دوران میں جب فلپ حتی کی "تاریخ اعراب" زیرِ مطالعہ تھی تو بعض ایسے مسایل بھی سامنے آئے جو براہِ راست سالنامہ کے موضوع سے تو غیر متعلق تھے، لیکن "تاریخ اسلام" سے یقیناً گہرا تعلق رکھتے تھے اور اس سلسلہ میں وہ بھی ضبطِ تحریر میں آگئے۔

ان میں ایک مقالہ "عہدِ بنی امیہ کے سیاسی و تمدنی حالات" سے تعلق رکھتا ہے، دوسرا "عہدِ عباسیہ کی تہذیب" سے، تیسرے مقالہ میں ان ذہنی رجحانات سے گفتگو کی گئی ہے جن کی بنیاد پر بہ لحاظ عقاید متعدد فرقے اسلام میں رونما ہوئے۔

آج کی صحبت میں پہلا مقالہ ملاحظہ فرمایئے جو عہدِ بنی امیہ کے سیاسی، مالیاتی و ثقافتی نظام سے تعلق رکھتا ہے۔ نیاز

بنو امیہ و بنو عباس دونوں خلافتوں کے زمانہ میں، ملک کے صوبوں کی تقسیم قریب قریب وہی تھی جو بازنطینی اور ایرانی حکومتوں کے زمانہ میں پائی جاتی تھی۔

ان صوبوں کی تقسیم یہ تھی:- (۱) شامی فلسطین - (۲) کوفہ (بہ شمول عراق) - (۳) بصرہ (بہ شمول فارس، سجستان، خراسان، بحرین، عمان، نجد و یمامہ) - (۴) آرمینیا - (۵) حجاز - (۶) کرمان (بہ شمول مقامات سرحد ہندوستان) - (۷) مصر - (۸) افریقیہ - (۹) یمن و جنوبی عرب -

اس کے بعد رفتہ رفتہ ان صوبوں کو ملا کر پانچ امارتیں (وائسرائلٹی یا نیابت خلافت) قایم کی گئیں - امیر معاویہ نے بصرہ اور کوفہ کو ملا کر ایک امارت سے متعلق کر دیا جس کا صدر مقام کوفہ تھا۔ چند دن بعد خراسان، ماوراء النہر اور سندھ و پنجاب میں نائب امیر بھی رہنے لگا۔

اسی طرح انھوں نے حجاز، یمن اور وسطی عرب کو ملا کر دوسری امارت سے متعلق کر دیا اور الجزیرہ (دجلہ و فرات کا دوآبہ) آرمینیا، آذربیجان اور شمالی ایشیاء کوچک کو ملا کر تیسری امارت بنا دیا۔ چوتھی امارت میں بالائے مصر اور زیرین مصر کے دونوں حصے شامل کر دئے گئے، پانچویں امارت مشتمل تھی شمالی افریقہ، اسپین، صقلیہ اور دیگر جزایر پر اور اس کا صدر مقام قیروان تھا۔

نظم و نسق کے تین شعبے تھے - (۱) سیاسی تسلط و اقتدار کا شعبہ - (۲) محاصل یا ٹیکس کا شعبہ - (۳) شریعت یا مذہبی قانون کا شعبہ اور ان تینوں شعبوں کی نگرانی علیحدہ علیحدہ تین حاکموں کے سپرد تھی - والیسرائے (یا امیر و صاحب) اپنا عامل یا نائب جہاں مناسب سمجھتا مقرر کر دیتا اور اس کی اطلاع دربارِ خلافت کو دیتا والیسرائے یا امیر تمام صوبہ کے سیاسی و فوجی انتظام کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ مالگذاری کے لئے ایک علیحدہ ذمہ دار افسر ہوا کرتا تھا جسے صاحب الخراج کہتے تھے اور وہ براہ راست دربارِ خلافت سے تعلق رکھتا تھا۔ سب سے پہلے یہ عہدہ امیر معاویہ نے قایم کیا۔ اس سے قبل صوبہ کا حاکم مالیات کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔

آمدنی یا محاصل کے ذرایع عہدِ بنی امیہ میں بھی وہی رکھے گئے جو خلفاء راشدین کے زمانہ میں پائے جاتے تھے، یعنی جزیہ و خراج جو مفتوح قوموں سے وصول کیا جاتا تھا۔ شہری یا مقامی نظم و نسق اور فوج کے مصارف مقامی آمدنی ہی سے پورے کئے جاتے تھے اور جو بچ جاتا تھا وہ خزانۂ خلافت کو بھیجدیا جاتا تھا۔ امیر معاویہ نے مسلمانوں کی تنخواہوں سے ڈھائی فی صدی سالانہ زکوۃ فنڈ کے لئے بھی وضع کرنا شروع کیا۔

عدلیہ کا تعلق صرف مسلم آبادی سے تھا، غیر مسلم آبادی کے معاملات خود ان کے مذہبی رہنما اپنی اپنی شریعت کے مطابق طے کرتے تھے - عہدِ نبوی اور ابتدائے خلافت راشدہ میں خود رسول اور خلفاء اور صوبوں میں ان کے نائب مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے، لیکن بعد کو عدلیہ کا شعبہ الگ کر دیا گیا اور قاضیوں کا تقرر کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے حضرت عمر نے مصر میں قاضی مقرر کیا (۲۳ھ) اور اس کے بعد رفتہ رفتہ عہدِ بنی امیہ میں تو قاضیوں کا تقرر گویا نظم و نسق کا ضروری جزو ہو گیا۔

قاضی کا انتخاب ہمیشہ فقہاء کی جماعت سے کیا جاتا تھا جو قرآن و حدیث کا ماہر سمجھا جاتا تھا۔ علاوہ فیصلۂ مقدمات کے قاضی وقف اور یتیموں کی جایداد کے انتظام کا بھی ذمہ دار ہوتا تھا۔

امیر معاویہ نے اس خیال سے کہ ان کی طرف جعلی احکام نہ جاری کئے جاسکیں ——— ایک دفتر "دیوان الخاتم" کے نام سے قایم کیا، جہاں احکام کی نقل رکھی جاتی تھی اور ان پر خلیفہ کی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ عبدالملک کے عہد تک دمشق میں اس کا ایک بہت بڑا دفتر ہوگیا تھا جہاں یہ سب ریکارڈ محفوظ رہتا تھا۔

عسکری تنظیم عہد بنی امیہ کی فوجی تنظیم وہی تھی جو بازنطینی فوجوں کی تھی۔ یعنی جس وقت فوج لڑائی پر جاتی تھی تو اس کے پانچ حصے ہوتے تھے ایک مقدمۃ الجیش دوسرا میمنہ (داہنی طرف کا حصہ) تیسرا میسرہ (بائیں طرف کا حصہ)۔ قلب (درمیانی حصہ) اور موخرالجیش (عقبی حصہ) فوجوں کی ترتیب قطاروں میں ہوتی۔ مروان نے فوجی ترتیب کو بدل کر اسے چھوٹی چھوٹی کمپنیوں میں تبدیل کردیا جنھیں کرواس کہتے تھے۔

یونانی پاہیوں کی طرح مسلم سپاہی بھی زرہ، بکتر، خود وغیرہ استعمال کرتا تھا اور آلات حرب بھی قریب قریب یونانیوں ہی کے سے تھے۔ سوار فوج کا زین گول ہوتا تھا۔ تلوار، نیزہ، تیر و کمان کے علاوہ عراوہ (BALLISTA) منجنیق (MANGONEL) اور دبابہ (BATTERING RAM) کا بھی استعمال ہوتا تھا اور یہ تمام وزنی آلات حرب اونٹوں کے ذریعہ سے منتقل کئے جاتے تھے۔

دمشق کی فوج بالکل شامی سپاہیوں پر مشتمل تھی، اور مشرقی صوبوں کے لئے فوجی بھرتی کا مرکز کوفہ اور بصرہ تھا۔ فوج کی تعداد ۶۰ ہزار تھی جس پر ۲ کرور درہم سالانہ خرچ ہوتا تھا۔ یزید ثالث نے فوجی تنخواہ دس فی صدی کم کردی اور اسی لئے وہ یزید ناقص کے نام سے مشہور ہوگیا۔ بنو امیہ کے آخری خلیفہ کے عہد میں (حسب بیان مسعودی) فوج کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔

جنگی کشتیاں بھی بازنطینی نمونہ کی تھیں اس کے دو حصے ہوتے تھے ایک بالائی حصہ (عرشہ) جو سپاہ کے لئے مخصوص تھا اور دوسرا زیریں حصہ جس میں ۵۰ چپو چلانے والوں کی جگہ بنی ہوتی تھی۔

شاہی مشاغل تفریح شام کا وقت عموماً خلفاء کی تفریح اور لوگوں سے ملنے ملانے کا ہوا کرتا تھا۔ امیر معاویہ کا معمول تھا کہ وہ اس وقت جنوبی عرب کے تاریخی روایات و قصص اور قدیم شعراء عرب کا کلام سنتے۔ "عبید ابن شریہ ان کے خاص داستان گو تھے جو ایام عرب کی داستانیں انھیں سنایا کرتے تھے۔ مشروبات میں شربت گلاب بہت مقبول تھا۔ یزید (معاویہ کا لڑکا) پہلا اموی خلیفہ تھا جس نے شراب پینا شروع کی اور اسی لئے اسے یزید الخمور کہتے تھے۔ اس نے ایک بندر (ابوقیس) بھی پال رکھا تھا جو مجلس شراب میں شریک ہوتا تھا۔ یزید روز شراب پیتا تھا لیکن ولید اول ایک دن ناغہ کرکے۔ ہشام جمعہ جمعہ پیتا اور عبدالملک مہینہ میں ایک بار پیتا لیکن بہت زیادتی کے ساتھ۔

یزید ثانی نغمہ و سرود کا بڑا شایق تھا اور اپنی دو مغنی کنیزوں سلامہ اور حبابہ سے حد درجہ مانوس تھا۔ ایک دن اس نے حبابہ کے منہ میں تفریحاً کھجور کی گٹھلی ڈال دی جس سے اس کی سانس بند ہوگئی اور مرگئی، یزید کو اس حادثہ کا اتنا صدمہ ہوا کہ آخر کار وہ بھی گھل گھل کر مرگیا۔ اس کا بیٹا ولید ثانی شراب خواری میں سب سے بازی لے گیا جو شراب کے حوض میں پیتا تھا اور اتنی شراب پی جاتا تھا کہ شراب کی سطح کم ہوجاتی تھی۔ یہ رقص و سرود کی محافل میں شراب پیتے پیتے اتنا بدمست ہوجاتا کہ عام و خاص کی تفریق باقی نہ رہتی۔

خلفاء بنی امیہ شکار، گھوڑ دوڑ، مرغبازی، نرد بازی کے بھی شایق تھے۔ چوگان بازی کا شوق عباسیین کے عہد میں بہت بڑھ گیا تھا لیکن اسکی ابتدا امویین کے آخری عہد میں ہوچکی تھی۔

خلفاء بنی امیہ کو کتوں اور چیتوں کے ذریعہ سے شکار کرنے کا بھی شوق تھا۔ ایران و ہندوستان کی طرح عہد جاہلیت کے عربوں میں بھی یہ شوق پایا جاتا تھا، لیکن عہد بنی امیہ میں یزید اول شکار کا بڑا شایق تھا اور اسی نے سب سے پہلے چیتے کو سدھایا جسے وہ اپنے گھوڑے کے کپچھے پر بٹھالیتا تھا۔ اسکے شکاری کتوں کے پاؤں میں طلائی حلقے پڑے رہتے تھے اور ہر کتے پر ایک ایک خادم مامور تھا۔

گھوڑ دوڑ کے شوق کا بھی یہی عالم تھا۔ ولید (عبدالملک کا بیٹا) سب سے پہلا اموی خلیفہ تھا جس نے پبلک گھوڑ دوڑ کا رواج دیا۔ اسکے بھائی سلیمان نے ایک نہایت وسیع پیمانہ پر گھوڑ دوڑ کا انتظام کیا لیکن اس کی تکمیل سے قبل وہ مرگیا۔ ہشام کے زمانہ میں شاہی اصطبل اور دوسرے امراء کے گھوڑ دل

کی تعداد چار ہزار تک پہونچ گئی تھی - اس کی ایک لڑکی کو بھی گھوڑ دوڑ کا بڑا شوق تھا اور اس کے اصطبل میں بھی متعدد گھوڑے پائے جاتے تھے -

حرم خلافت کی خواتین کو کافی آزادی میسر تھی - ایک بار مکہ کا مشہور شاعر ابو دہبل، امیر معاویہ کی لڑکی عاتکہ کو حج کے موقع پر بے نقاب دیکھ کر عاشق ہوگیا اور اس کی محبت میں عاشقانہ اشعار لکھنا شروع کئے - جب عاتکہ دمشق واپس گئی تو یہ بھی وہیں پہونچا اور آخر کار امیر معاویہ نے اس کو بڑی رقم دیکر اور کسی اچھی جگہ اس کی شادی کرا کے اس کی زبان بند کی - اسی طرح ایک اور مشہور خوبصورت شاعر وضاح الیمن نے ولید کی ایک بیوی سے محبت کا اظہار شروع کیا اور اس جرأت کی پاداش میں اس کو جان دینا پڑی -

خلفاء پر ان کی بیویوں کا اثر بھی کافی تھا، چنانچہ ایک بار عاتکہ (امیر معاویہ کی پوتی) اپنے شوہر ولید سے اتنی برہم ہوگئی کہ باوجود بار بار دروازہ کھٹکھٹانے کے اس نے ولید کو اندر آنے کی اجازت نہیں دی اور پھر ایک جھوٹی خبر سنا کر اسے باہر آنے پر آمادہ کیا گیا - حرم میں خواجہ سراؤں کے شمول کا رواج ابتدا ہی سے شروع ہوگیا تھا لیکن ولید ثانی کے زمانہ میں اس کو زیادہ ترقی ہوئی - یہ خواجہ سرا زیادہ تر یونانی ہوتے تھے -

دارالخلافت

اہل دمشق کا لباس اس وقت بھی وہی تھا جو اب نظر آتا ہے - چوڑے پائچے کے پائجامے، نوکدار سرخ جوتے، بڑا عمامہ، ڈھیلی ڈھالی عبا، سر پر شال (کوفیہ) اور عمامہ پر سربند (ایقال)، یہ تھی ان کی عام وضع، امراء سفید ریشمی عباؤں میں دمشق کی مسقف گلیوں کے اندر گھوڑوں پر نیزہ یا تلوار سے مسلح ہوکر نکلتے تھے - عورتیں نقاب ڈال کر بازاروں میں آتی جاتی تھیں اور کوٹھوں کی جالیدار کھڑکیوں سے بازار کا نظارہ کیا کرتی تھیں مٹھائی اور شربت بیچنے والے سڑکوں پر دورویہ دوکانیں لگا کر بیٹھتے اور چیخ چیخ کر نہایت بلند آواز سے اپنے مال کی تعریف کرتے، خچروں کی سواریوں اور باربرداری کے اونٹوں کی کثرت سے، دمشق کے بازار میں ہر وقت غیر معمولی چہل پہل رہتی تھی -

دمشق، حلب اور دوسرے مقامات میں رہنے کے مکانات ہر خاندان کے علٰحدہ علٰحدہ ہوتے تھے، ہر مکان کا صدر دروازہ سڑک یا گلی کی طرف ہوتا تھا صدر دروازہ سے داخل ہونے کے بعد ایک وسیع صحن نظر آتا تھا جس کے وسط میں ایک حوض ہوتا تھا جس کا فوارہ جاری رہتا تھا، کنارے کنارے ترنج و نارنج کے درخت نصب ہوتے تھے اور اس صحن کے چاروں طرف رہنے کے کمرے ہوتے تھے - بنو امیہ کے عہد میں آبرسانی کا بڑا اچھا انتظام تھا اور اس غرض سے متعدد نہریں کھودی گئیں جن سے شہر کو بھی پانی ملتا تھا اور کھیتوں کو بھی -

آبادی چار طبقوں میں منقسم تھی - سب سے اونچا طبقہ خلفاء کے بعد امراء کا تھا جن کو بڑے بڑے وظایف ملتے تھے، ولید اول کے زمانہ میں ایسے وظیفہ خوار امراء کی تعداد ۴۵ ہزار تھی اور مروان اول کے عہد میں حمص میں ۲۰ ہزار پنشن خوار موجود تھے - دمشق کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں کی تھی، شام میں البتہ عیسائی زیادہ تھے دوسرا طبقہ نو مسلموں کا تھا جن کو عربوں کی طرح شہری حقوق حاصل تھے کاشتکار طبقہ کو (جس میں مسلم و غیر مسلم دونوں شامل تھے) زمین کا محصول (خراج) ادا کرنا پڑتا تھا -

غیر مسلموں کو جماعتی حیثیت سے مسلمان بنانے کا کوئی واقعہ عہدِ بنی امیہ میں نہیں ملتا، البتہ خلفاء بنو امیہ میں عمر بن عبدالعزیز اور خلفاء ابن عباس میں متوکل نے ضرور ایسے احکام نافذ کئے جن کی وجہ سے بہتوں کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونا پڑا - مصر میں البتہ اسلام بہت زیادہ پھیلا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کا خراج جو عمر ابن العاص کے زمانہ میں ایک کرور ۴۰ لاکھ دینار وصول ہوتا تھا امیر معاویہ کے عہد میں گھٹ کر ۵۰ لاکھ رہ گیا اور ہارون الرشید عباسی کے عہد میں ۴۰ لاکھ - اسی طرح عراق کا خراج جو حضرت عمر کے عہد میں ۱۰ کرور وصول ہوتا تھا عبدالملک اموی کے زمانہ میں ۴ کرور رہ گیا - اس کا سبب یہ تھا کہ لوگ مسلمان ہوتے جاتے تھے چنانچہ عہدِ عباسیہ میں مصری، ایرانی اور آرامی نو مسلموں کی تعداد، عرب مسلمانوں سے بہت زیادہ ہوگئی تھی - جن میں سے بعض نے عراق میں شیعی مسلک اختیار کرلیا اور ایران میں خارجی مسلک، بعض نو مسلم ایسے سخت مسلمان ہوئے کہ انھوں نے غیر مسلموں کو کافی پریشان کرنا شروع کیا -

مسلم سوسائٹی میں سب سے پہلے جنھوں نے علوم و فنون کی طرف توجہ کی وہ یہی نو مسلم موالی تھے کیونکہ وہ اپنے ساتھ قدیم ثقافتی روایات لے کر آئے تھے اور ذہنی حیثیت سے وہ زیادہ ترقی یافتہ تھے - بعد کو عرب خاندانوں میں ان کی شادیاں بھی ہونے لگیں اور اس طرح عرب و غیر عرب خون ملکر سوسائٹی کا وہ تفاوت جو عرب و غیر عرب میں پایا جاتا تھا ختم ہوگیا -

تیسرا طبقہ اہل کتاب ذمیوں کا تھا جن میں زیادہ تر عیسائی، یہود اور صابی شامل تھے - یہ لوگ جزیہ و خراج ادا کرتے تھے اور اس کے عوض انھیں پورے

شہری حقوق مل گئے تھے، یہاں تک کہ ان کے معاملات خود انھیں کی شریعت کے مطابق ان کے مذہبی رہنما طے کرتے تھے۔ اہل کتاب میں بعد کو مجوسی، کفارِ حرّان اور بربر بھی شامل کر لئے گئے۔

سب سے نچلا طبقہ غلاموں کا تھا۔ ابتداءِ عہدِ اسلام میں جنگی قیدی عموماً غلام سمجھے جاتے تھے۔ بعد کو غلاموں کی خرید و فروخت بھی ہونے لگی اور بردہ فروشی عام ہوگئی۔ افریقہ کے سیاہ فام غلام، فرغانہ یا چینی ترکستان کے زرد رو غلام، مشرق ادنیٰ اور شمالی مشرقی یوروپ کے سفید رنگ غلام سبھی بازار میں آ آکر بکتے تھے۔ اسپینی غلاموں (صقالبہ) کی قیمت ایک ہزار دینار سے کم نہ ہوتی تھی اور ترکی غلاموں کی ۲۰۰ دینار۔

جنگی قیدی جو غلام بنائے جاتے تھے ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی۔ مقّاری کا بیان ہے کہ موسیٰ ابن نصیر نے افریقہ میں تین لاکھ جنگی قیدیوں کو غلام بنایا جن میں ۲۰ ہزار غلام اس نے ولید کے پاس بھیجدئے۔ اسپین سے اس نے اسی طرح ۳۰ ہزار لونڈیاں حاصل کیں۔ قتیبہ کو صغدانیہ میں ایک لاکھ غلام ہاتھ آئے۔ زبیر ابن العوّام اپنے بعد ایک ہزار لونڈی غلام چھوڑ کر مرا۔ خلفاء بنی امیہ کے دربار میں ایک ہزار لونڈی غلاموں کا پایا جانا معمولی بات تھی۔ لونڈیوں کے ساتھ نکاح نہیں ہوتا تھا لیکن جنسی تعلق کی عام اجازت تھی۔ لونڈیوں سے جو اولاد ہوتی تھی وہ حُر (آزاد) سمجھی جاتی تھی اور صاحب اولاد لونڈیوں کا مرتبہ بھی بلند ہوجاتا تھا اور وہ شوہر کی وفات کے بعد آزاد ہوجاتی تھی۔ اسلام میں لونڈیوں کو آزاد کرنا بڑا کارِ ثواب قرار دیا گیا اور اس طرح بردہ فروشی بھی کم ہوگئی اور غلاموں کا مرتبہ بھی اونچا ہوگیا۔

مکّہ و مدینہ ابتداءِ عہدِ اسلام و خلافتِ راشدہ میں مکّہ و مدینہ تعلیمات مذہب کا گھر تھے، جہاں قرآن و حدیث کے چرچے کے سوا اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ مکّہ، انس بن مالک اور عبداللہ ابن عمر کی وجہ سے اور مدینہ عبداللہ بن عباس کی ذات سے فن حدیث کا مرکز بن گیا لیکن عہدِ بنی امیہ میں ان دونوں مقدس شہروں کی حالت بالکل بدل گئی۔ چونکہ مدینہ دارالخلافت نہ رہ گیا تھا اس لئے وہ لوگ جو سیاسیات میں پڑنا نہ چاہتے تھے اور مالِ غنیمت کی وجہ سے کافی دولتمند ہوگئے تھے یہاں آ آکر بس گئے تھے اور لطف و تفریح کی زندگی بسر کرتے تھے۔ حسن اور حسین کے بعد ایسے خوشباش لوگوں کی تعداد یہاں بہت بڑھ گئی تھی اور شہر کے اندر قصور و محلات طیار ہوگئے تھے جہاں عیش و نشاط کی داد پوری طرح دی جاتی تھی۔ مکہ کا بھی یہی حال تھا اور اس کی حیثیت بھی تفریح گاہ کی ہوگئی تھی۔ الغرض عہد بنی امیہ میں یہ دونوں مقدس مقامات رقص و سرود، لہو و لعب کا مرکز بن گئے تھے۔ تمام شیوخ عرب رقص و سرود کی محفلوں میں زرق و برق لباس پہن کر، کپڑوں میں عطر لگا کر اور داڑھیاں رنگ رنگ کر شریک ہوتے تھے اور شام کی شراب سُرخ پی پی کر بدمست ہوجاتے تھے ان محافل کی رونق بازنطینی و ایرانی ناچنے گانے والیوں سے قایم تھی جنھیں وہ قیان کہتے تھے۔

عیش و نشاط، لطف و تفریح اور لہو و لعب کا یہ ذوق نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اونچے طبقہ کی خواتین بھی اس میں حصہ لیتی تھیں، اس ذوق کی خواتین میں سیدہ "سکینہ" بنت حسین کو بڑی شہرت حاصل تھی، وہ نغمہ و شعر کی بڑی شایق تھیں اور نغمہ و سرود کے جلسے اپنے مکان پر اکثر کیا کرتی تھیں، زیبائش و آرائش میں بھی اختراعات سے کام لینے میں وہ خاص شہرت رکھتی تھیں۔ چنانچہ انھوں نے جوڑا باندھنے کی ایک خاص وضع ایجاد کی جسے "طرۂ سکینہ" کہتے ہیں اور اس کا رواج عام ہوگیا۔ بعد کو عمر ابن عبدالعزیز نے اس وضع کا جوڑا باندھنا ممنوع قرار دیا۔ ان کی مذاق و تفریح کے واقعات تاریخ میں بکثرت ملتے ہیں۔

سکینہ کے ذوق کی ایک اور خاتون عائشہ بنت طلحہ تھیں۔ طائف میں پائی جاتی تھیں۔ یہ مشہور صحابی طلحہ کی صاحبزادی تھیں یہ بھی اپنے حسن و جمال اور خوش ادائی کے لحاظ سے بہت مشہور تھیں اور کہا جاتا ہے کہ اگر کسی محفل میں یہ اور سکینہ دونوں جمع ہوجاتیں تو نگاہیں زیادہ تر انھیں پر پڑتیں۔ ان کے حُسن کا یہ عالم تھا کہ ممکن نہیں کسی سے وہ کوئی بات کہیں اور وہ تعمیل نہ کرے۔ ایک بار وہ حج کے لئے مکہ گئیں اور دوران حج میں انھوں نے شریف مکہ سے کہا کہ جب تک میں ساتوں طواف نہ کرلوں، نماز کو ملتوی رکھا جائے، چنانچہ اس نے تعمیل کی اور اس جُرم میں خلیفہ عبدالملک نے اسے حکومت سے معزول کر دیا۔

عائشہ نے تین شادیاں کیں۔ ان کے دوسرے شوہر مُصعب ابن زبیر تھے جو سکینہ سے بھی شادی کر چکے تھے اور جنھوں نے دس دس لاکھ درہم جہیز میں ان دونوں کو دئے تھے۔ ایک بار انھوں نے عائشہ سے کہا کہ اپنے چہرہ پر نقاب ڈالے رکھیں، لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ خدا نے مجھے حُسن دیا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ خدا کے اس عطیہ کو میں لوگوں کی نگاہ سے پوشیدہ رکھوں۔

جوش ملیح آبادی

(اقتباس)

ابھی کل کی بات ہے ہماری بزم سخن کی صدارت کے لئے "جوش اعظم" کا نام بلا پس و پیش لیا جاتا تھا۔ وہ قبلۂ رندانِ جہاں تھے، "اپنی صدارت کے حافظ و خیام" تھے، حتیٰ کہ آہستہ آہستہ خود انھیں اپنی عظمت کا احساس ہو چلا اور اس قدر کہ "فردوسی و رودکی سمجھتا ہوں اُسے۔ مصرع بھی مرا آج جو دہراتا ہے"۔ لیکن زمانہ بڑا سخت گیر نقاد ہے۔ ابھی پندرہ، بیس سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا تھا کہ دیکھتے دیکھتے جوش کی عظمت کا یہ شاندار قصر زمین پر آ رہا۔ اس قصر کی بنیادیں بہت کمزور اور اس کی دیواریں اندر سے کھوکھلی تھیں وہ اتنی دیر بھی نہ قایم رہ سکیں کہ ابھی دو ایک نسلیں اور اس کی صنعت اور مینا کاری پر ایمان لاتیں۔ جوش کا شاندار بُت طیار کرنے والے پجاری "تراشیدیم و پرستیدیم" کے حدود کو بہت جلد پار کر گئے اور اب "شکستیم" کی منزل خود جوش کی زندگی میں اور ان کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ اپنی شکست کا یہ منظر جوش کے لئے بڑا سوہانِ روح ہے۔ وہی شاعر جسے اپنے آپ پر اتنا اعتماد تھا کہ اگر وہ مقبروں میں جا کر اپنا کلام سنائے تو قبر سے مُردے سر پیٹ کر نکل پڑیں۔ اسے آج یہ احساس ہے کہ اس کا ناز اُٹھانے والے ایک ایک کر کے اُسے چھوڑتے جا رہے ہیں:

باقی نہیں اک شعور رکھنے والا — صہبائے کہن سال کا چکھنے والا
کیا اپنے معانی کا میں رونا روؤں — الفاظ نہیں کوئی پرکھنے والا

..... ایک زمانہ تھا جب جوش ذرا سی تنقید بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو — کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو

لیکن "رنگ و بو" کی اس نبض کو اب وہ خود آہستہ آہستہ چھونے لگے ہیں۔ "اعترافِ عجز" کے عنوان سے حال ہی میں انھوں نے ایک نظم لکھی ہے جس میں بڑے درد و کرب کے ساتھ انھیں یہ احساس ہو چلا ہے کہ "میں کچھ بھی نہیں"

میرے کاخِ شاعری کی نیو میں سنگِ فتور — ایک طفلانہ بلوغ، اک کھوکھلا سن شعور
چند زلفوں کی سیاہی، چند رخساروں کی آب — گاہ حرفِ بے نوائی، گاہ شورِ انقلاب
وہ بھی کچھ جاگیر دارانہ بقولِ ناقداں — بے سوادِ بستۂ رسم و رہِ رومانیاں
وصل کے دو چار نغمے ہجر کی ایک آدھ آہ — قعرِ ناواقفیت، سطحِ دریا پر نگاہ
گاہ مرنے کے عزائم گاہ جینے کی اُمنگ،
بس یہی سطحی سی باتیں، بس یہی اوچھے سے رنگ

جوش کا یہ انجام بڑا عبرتناک ہے۔ جوش سے زیادہ خوش نصیب تو وہ شعرا تھے جنھیں کم از کم اپنے دور میں "ملک الشعرائی" کا مستحق سمجھ کر شاہانِ وقت کی طرف سے خلعت و خطابات نصیب ہوئے۔ چاہے ایک آدھ صدی کے بعد ان کی "ملک الشعرائی" کا طلسم اس طرح ٹوٹ گیا ہو کہ لوگ ان کا نام تک بھول چکے ہوں، لیکن جس حاضر میں جس طرح سائنس اور مشینوں کی ایجاد نے ہر شے کو برق رفتار بنا دیا ہے ادبی شعور اور تنقید کی رفتار میں بھی سرعت آ گئی ہے۔ جوش کے "اعترافِ عجز" سے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نئی نسل "اس کاخِ شاعری" کی ایک ایک اینٹ کو الگ الگ کر کے دیکھے گی جس کی نیو میں خود بقول جوش "سنگِ فتور" ہے۔

جوش کی شاعرانہ شخصیت سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ انھوں نے بیسویں صدی میں آنکھ کھولی۔ جوش کی شخصی نشو و نما اور ان کے ذہن کی تربیت جس طور پر ہوئی ہے اس کو اپنے کمالات کے لئے قرونِ وسطیٰ کا ماحول درکار تھا۔ جہاں بات کا بتنگڑ بنا دینے اور رائی کو پربت کر دکھانے پر انعام و اکرام کی

بارش ہوتی تھی ..... جوش ایسے زمانے میں شعر و ادب کے میدان میں آئے۔ جب اقبال کا سکہ چل رہا تھا جس کا فن علٰحدہ خصوصیات کا حامل ہے۔ جوش کی شخصیت میں وہ عناصر نہیں تھے جو اس نوع کی شاعری کے لئے ضروری ہیں اور نہ ہی جوش نے ان کے اکتساب کے لئے اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شاعری ایک علٰحدہ سمت میں جا پڑی۔ نہ وہ اقبال بن سکے اور نہ ہی اپنی صلاحیتوں کو اپنے دائرے میں رکھ کر خاطر خواہ ابھار سکے۔

بیسویں صدی میں آنکھ کھولنے کے بعد بھی جوش کا ذہن نیا نہیں ہے اور نہ ان کی شخصیت میں نئے دور کی روح ہے۔ اس کا پس منظر سمجھ لینا ضروری ہے۔

..... اپنے بچپن کے متعلق خود ان کے بعض بیانات بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً :.....

"..... مادی حیثیت سے وہ میری انتہائی فارغ البالی کا زمانہ تھا۔ گھر میں دولت پانی کی طرح بہتی پھرتی تھی اور اسی کے دوش بدوش اقتدار حکومت کا طنطنہ بھی شامل تھا"

اس ماحول میں پلا ہوا رئیس زادہ ممکن ہے اپنے خول کو توڑ کر کسی وقت باہر نکل آتا۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب اسے نئی تعلیم سے فایدہ اٹھانے کا موقع ملتا، لیکن جوش کی تعلیم برائے نام ہی رہی۔ ل احمد اکبر آبادی کے بیان کے مطابق "جوش نے گھر پر اردو اور فارسی کی درسی کتابیں پڑھیں اور پھر انگریزی کے لئے سیتاپور اسکول، جوبلی اسکول لکھنؤ کے علاوہ سینٹ پیٹرز کالج آگرہ اور علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے اور پڑھتے رہے لیکن تکمیل کہیں کسی بات کی نہ کر سکے۔ یہ شاید ممکن بھی نہ تھا۔ جوش کے مزاج میں ہمیشہ سے ایک والہیت سی رہی ہے اور طبیعت کا انداز لاابالیانہ ہے .....

..... علمی تہی مایگی، سیمابیت اور جاگیردارانہ عیش پرستی ان تینوں عناصر کا مرکب جوش کی شخصیت ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کے ان تینوں اجزا کو اپنی خود پسندی اور تنقیدی شعور کے فقدان کی وجہ سے ہمیشہ کچھ آگے ہی بڑھایا ہے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم اور گھر کے ماحول سے جو جاگیردارانہ ہونے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ بھی تھا اتنا اثر ضرور لیا کہ اردو اور فارسی شاعری کا مذاق پیدا کر لیا۔ لیکن قدیم یا جدید علوم کے گہرے مطالعے کا انھیں موقع نہیں ملا۔ ہمارے قدیم شعراء کم از کم اپنے زمانہ کے مروجہ علوم مذہب، فلسفہ، تصوف، علم کلام، منطق، حدیث، فقہ، طب اور عربی ادب سے واقف ہوتے تھے جس کی بنا پر ان کے ذہن کا ایک علمی پس منظر ہوتا تھا اب ان علوم کی جگہ سائنس اور نئے سماجی علوم نے لے لی ہے۔ جوش دونوں سے محروم ہیں۔ اسی لئے وہ خالص جذبات کے سہارے شاعری کر سکتے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی نظام فکر نہیں۔ جوش نے ابتدا میں اقبال کے انداز بیان کا چربہ اتارنے کی کوشش تھی لیکن بعد میں ان کی خطیبانہ شاعری کی مقبولیت اور شہرت نے انھیں اس مغالطے میں ڈال دیا کہ وہ اقبال کے حریف ہیں۔ کلیم الدین احمد نے جوش کی بعض مقبول ترین نظموں کو اقبال کی صدائے بازگشت کہا ہے۔ اقبال کی فارسی نظم "از خواب گراں، خواب گراں خواب گراں خیز" شایع ہوئی تو جوش نے "بیدار ہو، بیدار ہو بیدار" "ہشیار ہو ہشیار ہو ہشیار" "ہوشیار اے مرد غافل ہوشیار" "ہاں پیر مغاں، پیر مغاں دیکھ" "برسات ہے، برسات ہے، برسات ہے برسات" جیسی بہت سی نظموں کی جھڑی لگا دی۔ اسی طرح جوش کی نظم "بڑھے چلو، بڑھے چلو رواں دواں بڑھے چلو" کا سرچشمہ بھی اقبال کی فارسی نظم نغمہ ساربان (تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست) ہے۔ یہ سب نظمیں ایک طرح سے اقبال کی نظموں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ اقبال نے اپنی نظم خضر راہ لکھی جو بقول آل احمد سرور "ایک مفکر شاعر کا عہد نامہ جدید" (A New Testament) ہے اس نظم میں پہلی بار اقبال نے سرمایہ و محنت کی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا تھا اس موضوع کو جوش نے بھی اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور مزدور اور کسان کی شاعری کا ہمارے ادب میں ایک سیلاب سا بہہ نکلا۔ لیکن اقبال اور اس نوع کے شعرا میں وہی فرق ہے جو ایک مفکر اور ڈھنڈورچی میں ہوتا ہے۔ یہ شعرا بقول فیض انقلاب مزدور، کسان کا نام لے کر سینہ کوٹتے ہیں، گلا پھاڑتے ہیں اور اپنی بلند آواز کی مدد سے راستے کی تماشائیوں اور راہگیروں کو جمع کر لیتے ہیں اور ایک اونچے سے منبر پر کھڑے ہو کر نعرہ لگاتے ہیں۔ لیکن ان نعروں کا اثر بہت وقتی ہوتا ہے۔ یہ شاعری اپنے اندر ذہن (INTELECT) نہیں رکھتی اس میں اُبال اور گرمی ہے، گہرائی اور روشنی نہیں۔ جوش سیاسی اعتبار سے عام طور پر ان ترقی پسند جماعتوں کی پالیسی سے متفق رہے ہیں جو ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہی تھیں اور ان کے نعروں کے ساتھ خود بھی نعرہ لگایا ہے اسی لئے جب وہ اقبال کی شاعری کے بعض رجعت پسند عناصر کا ذکر سنتے ہیں تو اپنے آپ کو اقبال سے آگے اور اپنی شاعری کو اقبال سے زیادہ بلند مرتبہ سمجھ لیتے ہیں۔ جوش کو یہ نہیں معلوم کہ اقبال یا ان کی اس طرح اور شعراء جن کے پاس ایک نظام فکر اور فلسفۂ حیات ہے اور اس فلسفہ کی مدد سے انھوں نے کائنات کے بسیط حقایق کو اپنی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے اور اشیاء کی اندرونی تہوں تک پہونچے ہیں۔ ان کا کلام ہمیشہ ان شعراء سے زیادہ قدر و قیمت کا مستحق سمجھا جائے گا جو بغیر کسی فلسفیانہ بصیرت کے اپنے زمانہ کے بعض میلانات کا ساتھ دیتے ہیں

اعلیٰ شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس فلسفہ حیات کو شاعر نے پیش کیا ہے یا جن اقدار پر اس کا ایمان ہے اس فلسفہ حیات اور ان اقدار کے بدل جانے کے بعد بھی شاعر کے کلام کی عظمت باقی رہے۔ ٹیگور اور اقبال کے فلسفۂ حیات پر ایمان لانا ہمارے لئے ضروری نہیں۔ لیکن وہ اپنی بصیرت کی مدد سے کائنات کے رازہائے سربستہ کو جس طرح فاش کرتے ہیں اس کی وجہ سے ان کی شاعری میں ایک آفاقیت اور ہمہ گیر انسانیت ملتی ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کے کلام کا حسن اور اس کی ابدیت کبھی ختم نہ ہوگی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال اگر روحانی فلسفہ اور قدیم اقدار پر ایمان رکھتے تھے تو جوش مادی فلسفے کے ذریعہ اپنے افکار کا تانا بانا بُننا چاہتے ہیں لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ جوش نے جس مادی فلسفہ کو اپنایا ہے اسے جاننے اور سمجھنے کے لئے بھی کافی مطالعے، ریاضت اور جدید علوم پر دسترس اور عبور کی ضرورت ہے کجا اس کو اپنا نظریۂ حیات بنانا اور اس نظریے سے تمام مسایل کو دیکھنا اور اس طرح کی نظر گہرائیوں میں جاسکے اور کوئی گوشہ گرفت سے باہر نہ رہ جائے۔ جوش کی جدید علوم سے گہری واقفیت تو بڑی بات ہے وہ اس معاملہ میں بالکل صفر ہیں۔ جدید علوم کے بارے میں ان کی اطلاع اتنی بھی نہیں ہے جتنی آج کل کالج کے ایک معمولی طالب علم کو ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری میں جہاں انگریزوں سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں وہاں انگریزی تعلیم اور انگریزی زبان کی بھی مخالفت کرتے ہیں۔ "نازک اندام کالج سے خطاب" کرتے ہوئے کہتے ہیں :-

یوں تمھارے منھ کے اندر ہے فرنگی کی زبان — خوف ہے گونگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستان
یہ لباس مغربی جلووں کو چھپاتا نہیں — تم کو اس بہروپئے پن سے حجاب آتا نہیں
کیا غضب ہے تم سے روئے ایشیا آتی نہیں — سچ کہو کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں
زندگی طوفان ہے اور ناؤ ہو تم پاپ کی — آہ جیتی جاگتی بدبختیو ماں، باپ کی

علی گڑھ کی "پنجاہ سالہ جوبلی" کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں :

اتنے بہروپئے نظر آئے — اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے
پوستھیں مغربی اماموں کی — صورتیں مشرقی غلاموں کی،
پینٹ میں ہاتھ اور منھ میں سگار — شانے ہلتے ہوئے دمِ گفتار
طاق دل میں چراغ انگریزی — سر کے اندر دماغ انگریزی
چال انگریزی، ڈھال انگریزی — جسم کا بال بال انگریزی

جسمِ ہندی میں جان انگریزی
منھ کے اندر زبان انگریزی

یہاں جوش، اکبر کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ بقول آل احمد سرور "مغرب سے اس قدر بیزاری اکبر کے زمانہ میں تو معاف کی جاسکتی ہے کیونکہ اسوقت عام لوگ اتنا آگے دیکھ ہی نہیں سکتے تھے۔ آج یہ رجعت پسندی کی علامت ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ عزیز احمد نے اپنی کتاب "ترقی پسند ادب" میں جوش پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ان کے بلند کو میں بغایت بلند تو نہیں کہہ سکتا مگر پستش بغایت پست کا اطلاق ان پر یقیناً ہوتا ہے۔ اقبال کی طرح وہ شاعری میں ذہنی اور فلسفیانہ قوت پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ اقبال کے عظیم الشان علمی پس منظر اور پیش منظر سے محروم ہیں اس لئے جب جوش گہرائیوں میں جاتے ہیں تو انکی سطحیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ باوجود ان کے اس تمام جوش و خروش، اس تمام ابال اور شورش کے کبھی کبھی ان کے خلوص اور عقیدے پر بھی شک ہوتا ہے"۔۔۔۔۔ جوش اپنی جذباتیت کی بنا پر ہر پرانی چیز سے بغاوت کر دیتے ہیں۔ لیکن نئی زندگی کا کوئی تصور ان کے پاس نہیں۔ وہ نئی تحریکوں اور آزادی و انقلاب کی جدوجہد کے ساتھ رومانی طور پر وابستہ ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں ان کو اپنی ہیجان پسند طبیعت کے لئے تسکین کا سامان فراہم ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

جوش کی جن نظموں کی بنا پر انھیں شاعر انقلاب کہا گیا وہ دراصل ایجی ٹیشنل نظمیں ہیں۔ اس نوع کی شاعری کے لئے ایک زمانہ میں ظفر علی خاں کا قلم بڑا آتش انگیز سمجھا جاتا تھا اور زمیندار کے صفحات میں حالات حاضرہ سے متعلق جب حالات حاضرہ سے متعلق جب ان کی کوئی نظم آتی تو ایک تہلکہ سا مچ جاتا۔

جوش کے مزاج میں چونکہ ابل پڑنے والی کیفیت ہے اور بغاوت ان کے ذہن کی سب سے لذیذ غذا ہے۔ اس لئے برطانوی سامراج کے زمانہ میں غلامی سے بغاوت کرنے والوں کے ساتھ جوش نے بھی نعرۂ بغاوت بلند کیا۔ ان کی تشبیہیں اور استعارے، الفاظ کی گھن گرج، لہجہ میں آتش فشاں کا سا ابال اور گرمی۔ ان چیزوں نے ایک زمانہ میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ اس زمانہ میں ہندوستان ایک شدید تشنج کے عالم میں تھا اور ہر فرد بشر غلامی کا جوا اتارنے کے لئے بے قرار تھا۔ اسلئے غلامی سے بغاوت یا انگریز سے نفرت کا ہر نعرہ مقبول ہوا۔ جوش اسی زمانہ میں شہرت کے آسمان پر پہونچے کیونکہ باغیوں کے اس ہجوم میں ان کی آواز سب سے زیادہ اونچی اور سب سے زیادہ کڑک دار تھی۔ لیکن جس طرح سوڈے کا ابال دم کے دم میں ختم ہوجاتا ہے۔ جوش کی نظموں کا وقتی اثر کم ہونے لگا۔ اہلِ بصیرت نے اس پر انگلی رکھنا شروع کردی۔ مجنوں گورکھپوری نے موجودہ دور کے ادب پر تنقید کرتے ہوئے سب سے پہلے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا:

"ہمارے اکثر نوجوان شعراء جب انقلاب کا ذکر کرتے ہیں یا قدامت پرستی اور ترقی کے سوال کی طرف در پردہ یا کھلا ہوا کوئی اشارہ کرتے ہیں تو آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور ان کی شاعری وفورِ ہیجان میں یا تو محض تبرا ہوکر رہ جاتی ہے یا کرب و تشنج کی چیخ اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تو زندگی کے رموز اور انقلاب و ترقی کے اصول کا کتابی مطالعہ کیا ہے اور نہ خود ہی غور و فکر سے کام لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے اندر ظرف پیدا نہ ہوسکا اور وہ صرف چیخ پکار اور واویلا کو انقلابی نعرہ سمجھنے لگے۔ اور تو اور اس وقت جو شاعر ترقی پسندوں کی امامت کر رہا ہے اسکے یہاں بھی یہ کمزوری اہل فکر و بصیرت کو نمایاں طور پر اور افسوسناک حد تک محسوس ہوتی ہے۔ جوش کی انقلابی شاعری کا بہترین حصہ اکثر و بیشتر ایک کف دردہاں چیخ سے زیادہ وقیع نہیں۔ جوش کی شاعری اندر سے بے انتہا بے مغز اور کھوکھلی ہے"۔

..... آل احمد سرور کا خیال ہے کہ:

"جوش کی ان نظموں میں خیال کی گہرائی ناپید ہے ان میں خطابت کا دم خم زیادہ ہے وہ شعریت کم ہے جو اپنی ادبیت کی خاطر غم و غصہ کی آندھی کے بجائے گداز قلب کی دھیمی آنچ کو پسند کرتی ہے"۔

بعد میں چل کر جوش کی سیاسی اور انقلابی شاعری میں بڑے دلچسپ تضاد ابھرتے ہیں اور جب ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو انقلابی شاعری کا سارا طلسم بکھر کر رہ جاتا ہے ..... اس تضاد کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جوش کے سارے رجحانات انفرادی اور خود رو قسم کے ہیں ان کی افتادِ طبع جن باتوں کو پسند کرتی ہے وہ اس کے ساتھ جذباتی طور پر ہم آہنگ ہوجاتے ہیں لیکن اپنی شخصیت کو کسی واضح نظریۂ حیات سے وابستہ نہیں کرتے۔

..... جوش کے ذہن میں یہ بات صاف نہیں کہ کوئی انقلاب اس وقت تک وقوع پذیر نہیں ہوسکتا جب تک اس کے اسباب مکمل طور پر فراہم نہ ہوں۔ یہ اسباب معاشی ہوتے ہیں اور انقلاب ہمیشہ جمہور کی کاوشوں اور ان کی پیہم جد و جہد اور سعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جوش کی انقلابی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ انقلاب کوئی وحی ہے جو ان پر اتری ہے اور وہ اس کے پیغمبر اور نقیب بن کر آئے ہیں، قوم کی نجات انہیں کے ہاتھوں ہوگی۔ وہ انقلاب کا ہیرو ایک فرد کو سمجھتے ہیں اور اکثر یہ ہیرو خود جوش ہی ہوتے ہیں۔

قسم اس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں اُبھارے گا، کہ اے ہندوستاں جس وقت تو مجھ کو پکارے گا
مری تیغ رواں باطل کے سر پر جگمگائے گی تیرے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

چونکہ وہ اپنے آپ کو اس انقلاب کا ہیرو، پیغمبر اور نقیب سمجھتے ہیں اس لئے ان کی دانست میں پوری قوم سو رہی ہے وہ اپنے آپ کو اس قوم کا ایک فرد اور اس جدوجہد کا نمائندہ نہیں سمجھتے بلکہ اس سے برتر خیال کرتے ہیں۔ اب غصے میں آکر وہ اپنی قوم پر برس پڑتے ہیں اور اس کی تذلیل و تحقیر پر اتر آتے ہیں:۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ شاعر سے تو طلاقِ خدا کے لئے نباہ
اے سیہ رو، بے حیا، وحشی، کمینے بدگماں اے جبینِ ارض کے داغ اے دنی ہندوستاں
تجھ کو عورت نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ اے لعیں، آدمی کی نسل سے اور تو، نہیں ہرگز نہیں
کیا قہر ہے روئے بد پہ شیدا ہونا ذلت کے مقام پر ہویدا ہونا
انساں کی زبوں تریں بدبختی ہے بد اصل و دنی قوم میں پیدا ہونا

وطن اور ابنائے وطن کے بارے میں یہ تبرّے بازی اور سب و شتم کسی بھی انقلابی شریعت میں حلال نہیں۔ انقلاب کا اجتماعی تصور رکھنے والا اور اس کے سماجی اسباب و علل پر نظر رکھنے والا ذہن اس طرح سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہ غم و غصہ دماغی توازن خراب کر دیتا ہے اس سے تخریب تو ہو سکتی ہے تعمیر کی کوئی تصویر نہیں اُبھر سکتی۔ جوش کے یہاں انقلاب کا تصور بڑا ہولناک ہے۔ ان کو محض تخریب سے مطلب ہے اس لئے کہ بغاوت اُن کی فطرت ہے اور بغاوت کو تخریب سے تسکین ہوتی ہے۔ جوش بغاوت کا خیال آتے ہی آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔

یہ غیظ و غضب ان کی شاعری کو انتہائی کرخت بنا دیتا ہے:

ٹھوکریں کھاتا پھرے گا کج کلاہی کا غرور — دب کے پہیے سے نکل جائے گا شاہی کا غرور

"غدّار" سے وہ اس طرح خطاب کرتے ہیں:

ہوشیار، اے بے حیا غدار، اے نفس دنی — دیکھ آ پہونچا وہ اے بدبخت وقت جانکنی
اُنگلیاں اُٹھیں گی دُنیا میں تری اولاد پر — غلغلہ ہوگا وہ آتے ہیں رذالت کے پسر
تیری مستورات کا بازار میں ہوگا قیام — معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائے گا نام
اس طرف مُنہ کر کے تھوکے گا نہ کوئی نوجواں — بَر کی حسرت میں رہیں گی تیرے گھر کی لڑکیاں

اس طرح کی گھن گرج اور دشنام طرازی میں جرأت اور دلیری ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ جرأت اپنے اندر کوئی شعور نہیں رکھتی یہ کبھی کبھی نادان کے ہاتھ میں تلوار بن جاتی ہے جس سے وہ اپنا گلا کاٹ سکتا ہے اور اس کا بھی جس کا وہ دوست ہو۔

مثال کے طور پر کسان اور مزدور سے متعلق ان کی نظمیں دیکھئے تو ان کی نادان دوستی کی حقیقت آہستہ آہستہ کھلے گی "کسان" ان کی بہت مشہور نظم ہے۔ جس میں وہ کسان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں — ماہرِ آئینِ قدرت ناظمِ بزمِ جہاں،
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو گلشن پناہ — ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم — محرمِ آثارِ باراں واقفِ طبعِ نسیم

پھر کسان کے ہل کا ذکر اس طرح ہوتا ہے:

گون ہل ظلمت شکن قندیلِ بزمِ آب و گل — قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
خوشنما شہروں کا بانی رازِ فطرت کا سراغ — خاندانِ تیغ جوہر دار کا چشم و چراغ

یہ نری قصیدہ خوانی ہے جس میں کسی شعور کو دخل نہیں۔ پہلے زمانہ میں بادشاہ اور اس کی تلوار کا قصیدہ لکھا جاتا تھا۔ جوش نے کسان اور اس کے ہل کا قصیدہ لکھا ہے۔ دونوں روایتی ہیں۔ پھر یہی نہیں۔ کسان اور مزدور کی حالت زار کا ذکر کر کے وہ اس پر رحم کھاتے ہیں۔ یہ رویہ بقول فیض مارکسی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ مارکسی تو کسان اور مزدور کو سب سے زیادہ طاقت ور اور بیدار طبقہ سمجھتا ہے اور اس کی قوتوں پر ایمان رکھتا ہے جوش کا برتاؤ کسان اور مزدور کے ساتھ ایک رحم دل جاگیردار کا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ جوش انقلابی ہونے کے ساتھ ساتھ رند بھی ہیں۔ وہ خدا اور مذہب کے باغی اس لئے ہیں کہ وہ ان کے اخلاق پر پہرہ بٹھاتا ہے اور ان کی رندی اور ہوسناکی کے مطالبات کو پورا نہیں ہونے دیتا جوش نے مذہب سے بغاوت کر کے اشتراکیت کا سہارا لیا تھا لیکن جوش کو شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ اشتراکیت بھی اپنا ایک نظام اخلاق رکھتی ہے۔ اس کے یہاں رندی و ہوسناکی اور انقلاب پسندی دونوں ساتھ نہیں چل سکتیں۔ جوش اپنے آپ کو انقلاب کا ہیرو اور پیغمبر سمجھ کر انقلاب کا پیغام دیتے ہیں۔ مزدور اور کسان کا قصیدہ پڑھتے ہیں اور اس کی مظلومی پر ترس کھاتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہی اپنے میخانے میں چلے جاتے ہیں۔ جب ان کی گرفت ہوتی ہے تو ان کی انفرادیت پسندی اور انانیت عجیب گل کھلاتی ہے۔

وہی عوام جن کا وہ قصیدہ پڑھ رہے تھے۔ جب ان کی رندی اور عیش پرستی پر احتساب کرتے ہیں تو جوش برہم ہو جاتے ہیں:

ہاں میں واقف ہوں کہ برگشتہ ہیں مجھ سے وہ عوام جن کے افکار کو یرقان ہے، عقلوں کو جذام

انھیں خود اپنے گروہ میں ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو انھیں ٹوکتے ہیں۔

زہاد ہی کو نہیں ہے غیظ و اندوہ مجھ سے ناخوش ہے شاعروں کا گروہ

میری تر دامنی پہ گویا اے جوشؔ کرتی ہے مٹک کے بی گھٹا بھی "اُفوہ"

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اب باتیں بہت ہوچکیں، نعرے بازی کا وقت آگیا۔ اب عمل کی باری ہے تو جوشؔ اپنے پیغمبرانہ جلال میں آجاتے ہیں:

ترتیب سپاہ اور تنظیم عوام دونوں سے بلند تر ہے شاعر کا مقام

"تالیف مزاج پرسی و چارہ گری، میرا نہیں، میرے پیروؤں کا ہے کام

وہ عوام سے اپنے آپ کو برتر سمجھ کر انقلاب کی جدوجہد سے علیٰحدہ ہوجاتے ہیں۔ انھیں یہ کام بڑا گھٹیا معلوم ہوتا ہے جس سے انھیں عار آتی ہے وہ سمجھتے ہیں کہ شاعر عوام سے کوئی بلند تر مخلوق بلکہ خالق ہے۔

تعمیر پہ خالق کو نہ مجبور کرو، تخلیق کو پھر کون سنبھالے گا کہو

شاعر کو پکارو نہ مشقت کی طرف بھینسے کا جو کام ہے وہ گھوڑے سے نہ لو

آگے چل کر جوشؔ خود بے نقاب ہوجاتے ہیں اور ان کے بارے میں جو بات کہی گئی تھی کہ وہ ایک جاگیردار کی طرح عوام کو رحم کی بھیک دیتے ہیں اسکا اعتراف وہ خود کرنے لگتے ہیں:

بھوکوں کا ہوا خواہ جو ہے خود بھی نہ کھائے گرداب زدوں کا دوست کشتی نہ چلائے

اس منطق بے ہودہ کے کیا معنی ہیں گھوڑوں کا جو ہمدرد ہو گھوڑا بن جائے

..... جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ جوشؔ کی ساری گھن گرج ایک نادان کے ہاتھ کی تلوار ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس سمت رُخ کرے گی اور کس کا گلا کاٹے گی .....

جوشؔ نے اپنی سیاسی نظموں کا طلسم ٹوٹتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ شاید سرمایہ دار اور مزدور فلسفیانہ موضوع نہیں ہے۔ اس لئے انھوں نے اقبالؔ کے ایک اور محبوب موضوع "آدم اور ابلیس" کو اپنا تختۂ مشق بنایا۔ اقبالؔ کی نظمیں جبریل و ابلیس، ابلیس کی مجلسِ شوریٰ، میلادِ آدم، انکارِ ابلیس، اغوائے آدم، آدم از بہشت بیرون آمدہ، صبح قیامت اور روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے وغیرہ۔ اس موضوع پر فلسفیانہ اور ڈرامائی نظمیں ہیں۔ جوشؔ نے اس موضوع پر ایک طویل نظم لکھنے کا ارادہ کیا۔ جس کا عنوان انھوں نے "حرفِ آخر" رکھا ہے۔ کلیم الدین کے خیال کے مطابق "یہ طویل نظم نہیں ہے بلکہ کئی مختصر نظموں کو جوشؔ نے علیٰحدہ کہکر ایک سلسلہ میں باندھ دیا ہے" اس نظم کے بارے میں کلیم الدین کی رائے یہ ہے کہ: "اس میں وہی سطحیت اور شعور کا فقدان ملتا ہے جو جوشؔ کی خصوصیت ہے۔ اس میں تصورات کی کوئی نئی دنیا نہیں، اگلے برس کی تیلیوں سے ڈھانچہ طیار کیا گیا ہے"۔ ..... کلیم الدین کی یہ رائے صحیح ہے کہ: "ارتقا کو موضوع شاعری بنانے سے اچھی شاعری ہاتھ نہیں آتی۔ لفظوں کی زیادتی باتوں کی کمی نہیں چھپا سکتی۔ جوشؔ ہمیشہ بات کا بتنگڑ بناتے ہیں۔ لفظوں کے کھوکھلے ڈھول کو زور و شور سے بجاتے ہیں۔ اگر کسی شاعر نے اتنی بات کہدی کہ پہلے، بہت پہلے چاند، سورج، ستارے اور زمین سب کے سب ایک مجلے میں رقصاں تھے تو یہ کوئی نئی بات نہ ہوئی اور کوئی بڑی بات بھی نہ ہوگی اور صرف یہ کہ دینے سے وہ بڑا شاعر نہیں ہوجاتا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اس نے بات کیسے کہی ہے؟ اور جہاں کیسے کہی کی بات آتی ہے تو جوشؔ کی کمزوری ظاہر ہوجاتی ہے ..... جوشؔ کائنات سے متعلق جانی ہوئی باتوں کو لیتے ہیں اور انھیں نظم کرجاتے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں کی رنگینی اور ندرت، پرشکوہ ترنم اور پرعظمت روانی، معنی آفرینی اور خیال آرائی کے سہارے نظم کرجاتے ہیں لیکن یہ جانی ہوئی باتیں تخئیلی تجربہ نہیں بن پاتیں۔ یہ سائنس کی معلومات شعری حقیقت نہیں پاتیں ..... جوشؔ براہ راست مادے اور خیال کی کشمکش کو پیش کرکے مادیت کو ابھارتے ہیں۔ افکار ان کے اپنے نہیں اور جب ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں میں تکنیک کی خامیاں ہوتی ہیں تو پھر طویل نظم میں وہ کیسے کامیاب ہوسکتے ہیں۔ رعایت لفظی، تکرار، پرمغز باتوں کی کمی، لفظوں کی کھوکھلی نمائش چھوٹی نظموں میں نسبتاً آسانی سے کھپ جاتی ہیں۔ طویل نظموں میں تو ان خامیوں

میں اُبھار اور پھیلاؤ زیادہ ہوگا۔

جوش کی عام طور پر یہ عادت ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں کو اپنی قوت نظم کے بل بوتے پر شعر کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اگر کسی نے ان کو یہ بات سمجھا دی کہ یہ موضوع بڑا اہم یا ترقی پسند ہے تو جوش فوراً قلم سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں۔ چونکہ یہ موضوع ایک تخلیقی عمل سے گزر کر ان کی شخصیت اور ان کی شاعرانہ ادراک سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ اس لئے محض اس کا ایک خلاصہ یا دھندلا سا تصور لے کر قافیہ پیمائی شروع کر دیتے ہیں۔ انسان کی عظمت اقبال کی شاعری کا اہم ترین موضوع ہے۔ ان کی نظم محاورہ مابین غدار انسان (تو شب آفریدی چراغ آفریدم) بہت مشہور ہے۔ اسے دیکھ کر جوش بھی انسان کی عظمت کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ان کے پاس انسان کی عظمت کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں ہے اس لئے پہلے تو وہ ایک شعر لکھتے ہیں:

مری شان سے بحر و بر کانپتا ہے　　شجر کانپتا ہے حجر کانپتا ہے

لیکن جیسا کہ اختر اورینوی نے لکھا ہے۔ "ساری نظم صرف ایک شعر کی شرح ہو کر رہ جاتی ہے اور بس۔ اسی مطلع کو اور چودہ اشعار کے ذریعہ پہلو بدل بدل کر پیش کیا ہے۔ نظم کی ہیئت غزل کی ہے شاعر مقطع میں بھی وہی بات کہتا ہے جو مطلع اور دوسرے اشعار میں کہی گئی ہے۔

قسم جوش دنیا کے ہر خشک و تر کی　　کہ مجھ سے ہر اک خشک و تر کانپتا ہے

اس نام نہاد نظم کا میکانکی ارتقا محض قافیوں کے سہارے قایم ہے۔ بحر و بر، حجر، کمر، ہنر، شرر وغیرہ۔ رہبر طاقت صناعی نہیں محض قافیہ پیمائی ہے۔ ایک ہی خیال نئے قافیوں کی کلاہ پہن پہن کر نئے اشعار کے ناکامیاب بہروپ بدل بدل کر اور "کانپتا ہے" کی ردیف کے زیر اثر مسلسل ایک طرز کی حرکت و عمل کرتا ہوا نامرغوب طور پر سامنے آتا رہتا ہے۔ عام طور پر غزلوں میں ہر شعر ایک منفرد تجربہ کو پیش کرتا ہے یا سارے اشعار تنوع کے باوجود ایک جذبہ و کیف میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ غزل کی تیسری قسم ہے جو نظم نما ہے۔ مگر نظم نہیں اور ابتری خیال کی جگہ تکرار خیال کا عیب لئے ہوئے ہے۔ صرف تشبیہیں اور استعارے بدلتے جاتے ہیں۔ خیال یا تصویر و تاثیر میں کوئی ارتقا یا تنوع نہیں پایا جاتا صرف نیرنگیِ الفاظ نظر آتی ہے اور اکتاہٹ پیدا کرتی ہے۔ تسکین تکمیل، تاثر اور شفی پیدا نہیں ہوتی۔ کامل نقش تیار نہیں ہوتا اور انسان کا تراشہ محض ایک طفلانہ رٹ بن جاتا ہے"۔

ہیئت کا یہی رویہ جوش کی عام نظموں میں ملتا ہے۔ انھیں ایک بات یا ایک نکتہ ہاتھ لگتا ہے اسے وہ اپنا موضوع سخن بنا لیتے ہیں۔ چونکہ اس پر سوچنا اس کا تجزیہ کرنا، اندرونی تہوں کا پتہ لگانا اور تخلیقی ضبط کی منزل سے گزرنا جوش کے مزاج کے خلاف ہے۔ اس لئے وہ اسی ایک بات کو ایک شعر میں کہہ کر پھر اسی تکرار شروع کر دیتے ہیں اور سو سو طریقے سے اسی کو دہراتے ہیں۔ غالباً اسی لئے ملک راج آنند نے ایک بار کہا تھا کہ جوش اردو میں بہت اچھے چنگھاڑتے ہیں لیکن انگریزی میں ان کا ترجمہ کیا جائے تو گداس معلوم ہوتے ہیں (بحوالہ یوسف۔ کرشن چندر) اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ جوش کی نظم کا خیال ایک سطح پر آسکتا ہے۔ باقی سارا کھیل لفظوں کا ہوتا ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ اس میں شک نہیں کہ بہت بڑا ہے۔ جتنی ترکیبیں اور تشبیہیں ان کا ذہن سوچ سکتا ہے دوسروں کے بس کی بات نہیں لیکن یہ بات بھی غالباً اس لئے ہے کہ ان کا ذہن موضوع سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے خارجی طور پر الفاظ کی تلاش میں مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے ڈھیر لگا دیتا ہے۔ جوش ایسا معلوم ہوتا ہے نظم کو وہیں ختم بھی کر دیتے ہیں جب وہ لکھتے لکھتے تھک جاتے ہیں۔ اسی لئے وہ ایک ہی موضوع پر آٹھ شعر کی نظم بھی لکھ سکتے ہیں۔ اور اگر فرصت ہو اور طبیعت میں روانی ہو اور توانائی بھی میسر ہو تو اسی شعر کی نظم بھی طیار ہو سکتی ہے۔ ان کی کامیاب ترین نظمیں "نظام نو" "ہم لوگ" "مشاہدات"۔ "داغ جگر بیچتا ہوں"۔ "یوم بہار"۔ "آج کی رات"۔ "شام کارواں"۔ "تیرے لئے"۔ "کب آئے گا؟" "ابدی شعلہ"۔ "خرابات"۔ "جہاں میں تھا" وغیرہ۔ اسی نوع کے "نظم تکرار" کے نمونے ہیں۔ جس میں "خون جگر" کے بجائے دماغی ورزش کام کر رہی ہے۔ جوش تخلیق کے تمام مرحلوں سے گزرنے اور اپنے موضوع کی تحلیل کرنے کے بجائے صرف اس کے بیان کو ہی فن سمجھتے ہیں اور اسی نظر کو برتتے رہے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں انھوں نے خود اس کا اعتراف کر لیا (شاعری میں بیان ہے سب کچھ کاش تم کو یہ ہو سکے محسوس) احتشام صاحب کا خیال ہے کہ جوش کا یہ نظریہ گمراہ کن ہے لیکن وہ خود اس پر عامل نہیں ہیں۔ احتشام صاحب نے دراصل مروت سے کام لیا ہے ورنہ جوش کی بیشتر نظموں میں یہی عمل کارفرما ہے۔

جوش کو چونکہ خود ہی اپنے موضوعات و نظریات کے پیچ و خم کا علم نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک وقت میں کسی سے سن کر جو بات کہتے ہیں دوسرے وقت

بالکل اس سے الٹی بات کہہ دیتے ہیں۔ بعض وقت یہ الٹی بات کسی اور کی سمجھائی ہوئی ہوتی ہے۔ جسے جوش وقتی طور پر صحیح تصور کر لیتے ہیں یا خود جوش کی شخصیت کے اندر چھپے ہوئے بعض عناصر ابھر کر ایسے خیالات پیدا کر دیتے ہیں جن سے پہلے کہی ہوئی باتوں کی تکذیب ہو جاتی ہے۔ "انسان کا ترانہ" لکھتے وقت جوش انسان کی عظمت کے اس قدر قایل تھے کہ اس کے سامنے شجر و حجر، کوہ و کمر، سب کانپتے تھے لیکن جبر مشیت کا روایتی عقیدہ بھی ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں رینگتا رہتا ہے اور بالآخر ابھر آتا ہے

محشر میں پنہاں ہے ہیں مجھ کو زنجیر — اک بندۂ مجبور کی آخر تقصیر
آواز تو دو کوئی کدھر ہیں آخر — ماحول وراثت و سرشت و تقدیر

خواہش کا رفیق کار نکلا وہ بھی — بے عنصر اختیار نکلا وہ بھی
انساں کے ارادے کو کیا جب تحلیل — اک نوع کا اضطرار نکلا وہ بھی

کس منہ سے کہوں کہ راہ پیما ہوں میں — قادر ہوں عمل پر کارفرما ہوں میں
دریا کے اشارے پہ جو چلتا ہے سدا — امواج حوادث کا وہ تنکا ہوں میں

بقول ڈاکٹر محمد عزیر "ماحول و وراثت و سرشت و تقدیر کے حصار میں پناہ گزیں ہونا فی نفسہ کوئی باعث تعجب بات نہیں لیکن جس کی زبان سے "انسان کا ترانہ" آپ سن چکے ہوں اس کی زبان سے یہ سن کر ضرور حیرت ہوتی ہے"۔

جوش نے جبر کے اس عقیدے کو اپنی متعدد نظموں میں پیش کیا ہے اور نظیر اکبر آبادی کے طرز پر "اے وائے آدمی"۔ "اب تک تو خاک چھاننے والا ہے آدمی"۔ "اب تک تو صرف روٹی کا گالا ہے آدمی" کہکر آدمی کی بے بسی اور مجبوری کا رونا رویا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ انسان کے ارتقا اور اس کی عظمت کا جو موضوع انھوں نے اٹھایا تھا اس کے متعلق ان کے ذہن میں کوئی واضح نظریہ نہیں تھا اس لئے اپنی فطری بے راہ روی کے سہارے اس سے بالکل متضاد باتیں سوچنے لگے اور انسان کی تذلیل و تحقیر پر یہاں تک اتر آئے۔

انسان ہے آج تک جہول اور ظلوم، — حکمت نہ ذہانت نہ بصیرت نہ علوم
افسوس کی کینچلی میں لپٹے ہوئے ذہن — اب تک ہیں نسیم آگہی سے محروم

قرنوں ابھی ٹوٹیں گے ہزاروں تارے — سر سے ابھی گزریں گے کروروں دھارے
انسان بننے میں ہے ابھی وقت بہت — اب تک تو فقط دم ہی جھڑی ہے پیارے

ان کی تازہ ترین نظم جسے وہ اپنی فلسفیانہ نظم سمجھتے ہوں گے "عقل و عشق" ہے اس نظم کے ذریعہ جوش، اقبال کے "فلسفہ عقل و عشق" کا جواب لکھنے بیٹھتے ہیں۔ جوش اب تک اپنی رندانہ شاعری میں جنون و خرد کا وہی روایتی تصور پیش کر رہے تھے جو فارسی اور اردو شاعری میں عام تھا لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ اقبال کا نظریہ عقل و عشق ایک غیر ترقی پسند نظریہ ہے، اس کی بنیاد عینیت پر ہے اور اس کے گمراہ کن نتائج نکل سکتے ہیں تو انھوں نے بغیر سمجھے بوجھے "عقل و عشق" کے نظریے کو الٹا کھڑا کر دیا یعنی اقبال عشق کو عقل پر ترجیح دیتے تھے تو جوش عشق پر عقل کو ترجیح دینے پر اتر آئے اور اس عقل کا منبع خود اپنی ذات کو سمجھنے لگے۔ جوش نے چونکہ اندھیرے میں اپنے سمند فکر کو چھوڑا تھا اس لئے اس کی باگ کو نہ سنبھال سکے۔ اور بالآخر اس سے بھی زیادہ رجعت پسندی کی دلدل میں پھنس گئے۔ وہ پورے ایشیا کے جمہور میں صرف اپنے آپ کو صاحب عقل سمجھتے ہیں۔ باقی سارے لوگ اس سے عاری ہیں۔ آگہی اور بیداری کی دولت صرف جوش کے حصے میں آئی ہے۔ باقی ساری قوم محو خواب ہے۔

بس اک تو داد دے سکتا ہے میری اس تباہی کی — کہ میں بیدار ہوں سوتے ہوؤں کے درمیاں ساقی
"ہند و پاک کیا کل ایشیا اک خواب آیا ہے — یہ میرا جوش بیداری کو لے جائے کہاں ساقی

اس خطرناک گڑھے میں گرنے کے بعد بھی اگر جوش کسی فلسفۂ حیات کے مدعی ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مرض لاعلاج ہے۔

(فکر و نظر) خلیل الرحمان اعظمی

خُدائی

فضا ابن فیضی :

دائمی یہ سناٹا، مستقل یہ ویرانی
ختم ہو تو کیوں کر ہو آئینے کی حیرانی

تیرگی اُچھالی ہے کتنی جلوہ گاہوں نے
کتنے ظلم ڈھائے ہیں عافیت پناہوں نے

تیرہ ناک راتوں سے چاند ہے خجل اب تک
آہ! زخم خوردہ ہے روحِ آب و گل اب تک

برگِ گل پہ چھڑکا ہے خون دستِ شبنم نے،
بازپرس کی اکثر زخمِ دل سے مرہم نے

کتنے لالۂ جل اُٹھے اپنے دل کے داغوں سے
اب بھی کتنے پروانے دُور ہیں چراغوں سے

کتنے دیدہ ور اب بھی صیدِ کم نگاہی ہیں،
اب بھی کس قدر سورج مخزنِ سیاہی ہیں

اب بھی کس قدر موسیٰ طور کے شکاری ہیں
اب بھی کتنے پیغمبر امتوں پہ بھاری ہیں

فتنۂ زمانہ کو پھر مذاق سوجھا ہے
برق نے نشیمن کا پھر مزاج پوچھا ہے

علم و فن کے گہوارے مرکزِ حوادث ہیں
کتنے نادر و سنجر معبدوں کے وارث ہیں

جہل کے شراروں سے جل بجھے مکاں کیا کیا
دانش و بصیرت کے مٹ گئے نشاں کیا کیا

حرص کے درندے ہیں خوشنما لباسوں میں
خود یزید شامل ہے کربلا کے پیاسوں میں

کب ہوس فراغت کی آدمی کو راس آئی
موت سے لرز اُٹھی زندگی کی برنائی،

گردشِ زمانہ بھی سانس لے نہیں سکتی
آگ اپنے پیاسے کو برف دے نہیں سکتی

کب ملے گی اب آخر دولتِ سکوں مجھ کو
آہ! پھونک دیتا ہے سوزِ اندروں مجھ کو

کیا تری مشیت بھی رحم کھا نہیں سکتی،
کیا کبھی تری دُنیا چین پا نہیں سکتی

تا بہ کے یہ رسوائی شانِ کبریائی کی
تجھ کو لاج رکھنی ہے آخر اس خدائی کی

فنِ تحریر کی تاریخ

جنوبی عرب کے رسوم خط

(بہ سلسلۂ دسمبر ۵۴ء)

"دُنیا کے رسوم خط" پر فاضل مقالہ نگار نے ۵۳ء سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اول اول انھوں نے ۵۳ء میں: "فن تحریر کی ابتدائی صورت" ـــــ "نیم مہذب اقوام کا تصویری رسم خط" ـــــ "مہذب اقوام کے تصویری رسوم خط"۔ (مصری ہیرو غلیفی، سمیری، بابلی، اشوری، سندھی، حطی، چینی، جاپانی وغیرہ) پر اظہار خیال کیا تھا۔ اس کے بعد ۵۴ء میں انھوں نے "سامی رسوم خط" (فنیقی، آرامی، عبرانی، سریانی، عربی، منگولی وغیرہ) پر روشنی ڈالی۔ اب ۵۵ء میں پھر یہ سلسلہ شروع ہوتا ہے جو دسمبر تک جاری رہے گا۔

نیاز

مختصر تاریخ تاریخ کی کتابوں میں عام طور پر جنوبی عرب کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے اس قطعۂ ارض کی تاریخ سے کم لوگ واقف ہیں، ہم اس کی تاریخ بیان کرنے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے۔

مسیح سے پہلے کی دس صدی تک یمن ایک اعلیٰ تہذیب کا مرکز رہ چکا تھا۔ اہلِ روم اُسے (Arabia Felix) یعنی "عربِ زرخیز" کہتے تھے۔ ملایا۔ ہندوستان، مشرقی افریقہ اور جنوبی عرب کا مال (سونا، چاندی، ہاتھی دانت، ریشم، بندر، مور، صندل کی لکڑی، مصالحے اور لوبان وغیرہ) یمن ہی سے ہو کر بحیرۂ روم کے ممالک کو جاتا تھا۔ لیکن جب بطلیموسوں نے ہندوستان اور اسکندریہ کے مابین تجارت کے لئے خشکی کا ایک دوسرا راستہ دریافت کر لیا تو یمن کی تجارتی اہمیت ختم ہو گئی۔

یونانی مورخ ہیرو ڈوٹس نے رومی مورخ اسٹریبو نے اور عرب مورخین ابن اسحاق، واقدی، ابن قتیبہ اور ابن خلدون نے یمن کے بارے میں کافی معلومات فراہم کی تھیں لیکن اُن کا بڑا حصہ مجہول روایتوں پر مبنی ہے۔ ہمیں یمن کی تاریخ کا صحیح پتہ اُن کتبوں سے چلتا ہے جنھیں اُنیسویں صدی میں مغربی عالموں، سیاحوں نے دریافت کیا۔ ان کتبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی عرب میں وقتاً فوقتاً چار حکومتیں قایم ہوئیں یعنی حکومت معین (Minaean) حکومت سبا (Sabaean) حکومت حضرموت (Hadramut) اور حکومت قتابنی (Qatabanian) انکی تفصیل یہ ہے:

حکومت معین - یمن میں قدیم ترین حکومت معین کی تھی جس میں کتبوں کے مطابق ۲۵ بادشاہ گزرے ہیں ـــــ معینی زبان کے کتبات شمالی عرب میں بہ مقام العلا ملے ہیں جو اہل یمن کی ایک نوآبادی تھی۔ یہاں سے ہو کر جنوبی عرب کا مال مصر اور فلسطین کو جاتا تھا۔ ایک معینی کتبے میں سبائی خانہ بدوشوں کا العلا کے تجارتی راستے پر لوٹ مار کرتے رہنے کا تذکرہ ہے اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہی رہزن بعد میں ہجرت کر کے یمن میں جا بسے اور سبائی حکومت قایم کی۔ لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ سبائی کتبات میں اہل معین کا ذکر نہیں۔

اہل معین کے حضرموت والوں سے دوستانہ تعلقات تھے اور دور دور تک اُن کا اثر پھیلا ہوا تھا۔ اُن کی حکومت کے قیام کا صحیح زمانہ نامعلوم ہے۔ بعض عالم اُن کی حکومت کی وسعت، بادشاہوں کی تعداد اور ترقی یافتہ زبان و رسم خط کی بنا پر ۱۵۰۰ ق۔م بتاتے ہیں۔ اس امر پر بھی علماء میں اختلاف ہے کہ حکومت معین، حکومت سبا سے پہلے موجود تھی یا دونوں حکومتیں ہمعصر تھیں۔ بہرحال اس حکومت کا کوئی کتبہ ۸۰۰ ق۔م سے پہلے کا نہیں ملا ہے۔ اس وقت تک معینی حکومت کافی کمزور ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ قتابنی ریاست نے حکومت سبا کو اپنی طرف ملا کر ۷۰۰ ق۔م حکومت معین کو ختم کر دیا۔

حکومتِ سبا - عربی روایات کے مطابق یمن کے قبیلوں کا مورثِ اعلیٰ قحطان تھا جسے کتاب پیدائش میں (Joktan) کہا گیا ہے۔

اہل سباء عبد شمس سباء کے نام سے منسوب ہیں جو قحطان کا پرپوتا تھا۔ اُس کا بیٹا حمیر تھا جو حمیریوں کا مورثِ اعلیٰ ہے۔

مذہبی روایات کے مطابق اس ملک کی ایک ملکہ نے جسے یہودی ملکہ سباء کہتے ہیں اور مسلمان بلقیس ۹۵۰ ق۔م حضرت سلیمان سے ملاقات کی تھی اور اُنھیں تحایف پیش کیے تھے[1]۔ لیکن کتبوں میں کسی جگہ اس کا ذکر نہیں ہے۔ سبائی کتبات آٹھویں صدی ق۔م یا اس سے بھی کچھ پہلے کے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نویں صدی سے چھٹی صدی ق۔م تک کے بادشاہ اپنے کو مکرب کہتے تھے (یہ سباء کی تاریخ کا پہلا دور ہے) وہ بیک وقت پروہت بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ اُن کا دارالحکومت سرواہ تھا۔

دوسرا دور تقریباً ۵۵۰ ق۔م سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ کے حکمراں اپنے کو "سباء کا بادشاہ" کہتے تھے اُن کا دارالحکومت مارب تھا۔

اہل سباء برابر اپنی پڑوسی حکومتوں حضرموت اور قتابنو سے لڑتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۱۵ ق۔م میں حمیری اُن پر غالب آگئے۔ قرآن (سورۂ سباء) سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سیل عرم سے تباہ ہوئے۔ عرم ایک بند کا نام تھا جس کا تہائی حصہ اب تک باقی ہے۔ اس پر سبائی خط کے متعدد کتبے ہیں جن کی نقلیں گلاسر نے حاصل کی تھیں۔

حکومت حمیر — تقریباً ۱۱۵ ق۔م میں جنوبی عرب کی حکومت اہل سباء سے حمیریوں کے ہاتھ میں چلی گئی، جو عرب کے جنوب مغرب میں آباد تھے۔ اس زمانہ میں قتابنی حکومت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ نئے حکمرانوں نے "بادشاہ سبا اور رائدان" کا لقب اختیار کیا۔ چوتھی صدی میں اہلِ حبشہ نے (جو دراصل جنوبی عرب کے مہاجر تھے) حمیریوں سے ٹکر لی اور جنوبی عرب میں اپنے خاندان کی حکومت قایم کی۔ بعد ازاں حمیریوں نے یہودی مذہب اختیار کرلیا اور چونکہ اہلِ حبشہ، عیسائی ہوگئے تھے لہذا یہودی اور عیسائی مذہب کے نام پر جنگ ہوئی۔ بازنطینی سلطنت نے اہلِ حبشہ کی مدد کی اور وہ ۵۲۵ء میں کامیاب ہوگئے۔ لیکن ۵۷۵ء میں اہلِ فارس نے (جو عیسائی مذہب کے دشمن تھے) انھیں نکال باہر کیا اور یمن میں اپنے گورنر مقرر کیے۔ ۶۲۲ء میں ظہورِ اسلام کے بعد جنوبی عرب سے ایرانی اقتدار کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

حضرموت اور قتابنی حکومتوں کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں اور یہ حکومتیں زیادہ اہم بھی نہ تھیں لہذا اُن کے ذکر کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

جو کتبے دستیاب ہوئے ہیں وہ دو حصّوں میں منقسم ہیں: (۱) شمالی عرب کے کتبے اور (۲) جنوبی عرب کے کتبے۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

جنوبی عرب کے کتبے — سب سے پہلے ۱۸۱۱ء میں ایک شخص مسمی (U.J. Seetzen) نے پانچ کتبوں کی نقلیں حاصل کی تھیں، لیکن باقاعدہ علمی تحقیقات (Joseph Halevy) نے شروع کی اور ۶۹-۱۸۶۹ء میں اس نے ۶۰۰ کتبے حاصل کیے۔ اس کے بعد کچھ اور کتبوں کی دریافت ہوئی حتیٰ کہ (Eduard. Glaser) نے اپنی تین مہموں ۸۸-۱۸۸۲ء کے درمیان مزید ۱۰۳۲ کتبے حاصل کیے یہ کتبے پتھر اور دھات کی تختیوں پر کندہ ہیں اور اچھی حالت میں ہیں۔ تقریباً ۲۵۰۰ کتبوں کی نقلیں معہ تشریح کے کتابی صورت میں شایع ہوچکی ہیں۔ ان کی پانچ قسمیں ہیں (۱) معینی - (۲) سبائی - (۳) حمیری - (۴) قتابنی - (۵) حضرموتی۔

ان کتبوں کا رسم خط جو ۲۹ حروف پر مشتمل ہے نہایت ہی خوشنما، سڈول اور پاکیزہ ہے۔ حروف کو بغیر ملائے جدا جدا لکھا گیا ہے اور الفاظ کو ایک عمودی خط کے ذریعہ علٰحدہ کیا ہے۔ شروع میں حروف زاویے دار تھے بعد میں اُن کے کنارے گول ہونے لگے اور اُن میں گھماؤ پیدا ہوگیا۔

زیادہ تر کتبے دائیں سے بائیں کو لکھے گئے ہیں لیکن بعض دو رخی ہیں یعنی باری باری ایک سطر دائیں سے بائیں کو لکھی گئی ہے اور دوسری بائیں سے دائیں کو ان میں واضح طور پر دو زبانیں معینی اور سبائی نظر آتی ہیں۔ ایک تیسری قسم قتابنی معینی ہی کی ایک قسم ہے[2]۔ یہ زبانیں اور حبشہ کی زبانیں جنوبی سامی کہلاتی ہیں۔ ان کا شمالی مغربی سامی (یعنی فنیقی، آرامی، عبرانی وغیرہ) اور شمالی مشرقی سامی (بابلی اور آشوری وغیرہ زبانوں سے گہرا تعلق ہے۔

شمالی عرب کے کتبے — شمالی مغربی عرب، شام اور شرق اردن میں ملے ہیں۔ انھیں خانہ بدوش قبیلوں نے چٹانوں پر کندہ کیا تھا۔ یہ کتبے چھوٹے ہیں اور ان میں سے اکثر کا رسم خط ٹیڑھا میڑھا اور گھسیٹ ہے۔ انھیں تین مجموعوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:-

(۱) ثمودی کتبے — ثمود، مغربی عرب کی ایک پرانی قوم تھی جس نے تقریباً ۱۵۰۰ کتبے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان کے زمانہ کے بارہ میں اختلاف ہے۔

[1] عہد نامہ قدیم ۲ تواریخ باب ۹ آیات ۱-۱۲، اسلاطین باب ۱۰ آیات ۱-۱۳۔ قرآن سورۂ نمل

[2] یہ قدیم زبانیں ہیں۔ موجودہ زبانوں میں مہری، شحری اور سقوطری ان سے رشتہ رکھتی ہیں۔

قدیم ترین کتبے پانچویں صدی ق۔م کے اور جدید ترین چوتھی صدی عیسوی کے ہیں۔

(۲) دیدانی اور لحیانی کتبے — دیدان ایک آزاد ریاست تھی جو موجودہ العلا کے نخلستان (شمالی حجاز) میں واقع تھی۔ اس کے قدیم ترین کتبے ساتویں یا چھٹی صدی ق۔م کے ہیں۔

شمالی عرب میں ایک مشہور قبیلہ بنی لحیان کا تھا جس کے رسم خط کو جدید دیدانی کہا جا سکتا ہے۔ اس کے کتبے پانچویں سے دوسری صدی ق۔م کے ہیں۔ یہ بھی العلا میں ملے ہیں۔

(۳) صفوی کتبے — صفاۃ دمشق کے جنوب مشرق اور جبل حوران کے مشرق میں ایک چٹانی علاقہ ہے۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں کتبے ملے ہیں جن کا زمانہ پہلی اور دوسری صدی عیسوی ہے۔ اسی مقام پر اور اسی زمانہ کے آرامی کتبے بھی ملے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر دو مختلف قومیں آباد تھیں ایک تحطانی اور دوسری نبطی۔ ہلیفی کا خیال ہے ان میں سے بہت سے کتبوں کو اُن ثمودی سپاہیوں نے کندہ کیا تھا جو رومی افواج میں شامل تھے لیکن زیادہ قرین قیاس یہ خیال ہے کہ ثمودی قبیلے چراگاہوں کی تلاش میں فاۃ تک پہونچ گئے تھے۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۱۶)

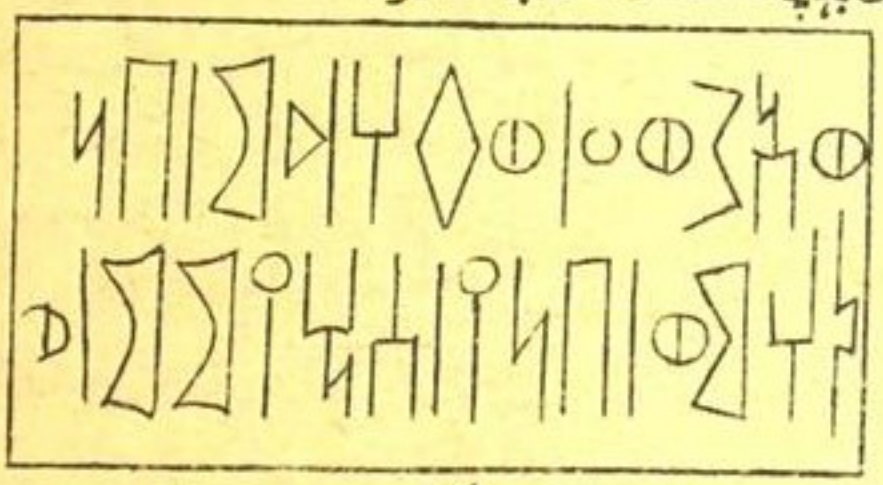

معینی کتبہ

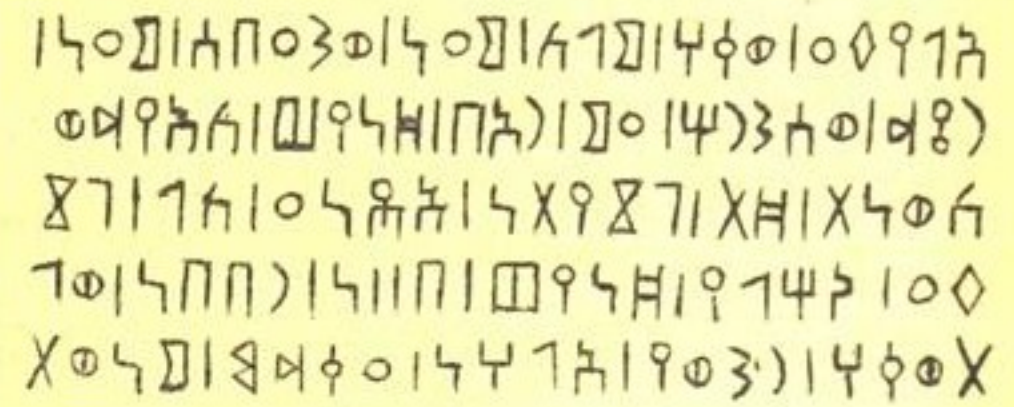

سبائی کتبہ

ایجاد۔ جن عالموں نے جنوبی سامی خط کی ایجاد کے مسئلہ پر غور کیا ہے اُن کے نزدیک جنوبی سامی کے صرف نو حروف شمالی سامی سے مشابہ ہیں۔ (شکل نمبر ۱) بقیہ حروف کی شکلیں مختلف ہیں۔ اس سے اُنھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جنوبی سامی رسم خط شمالی سامی سے براہ راست ماخوذ نہ تھا بلکہ دونوں کا ماخذ ایک تھا۔ اس سلسلہ میں تین خاص نظریے پیش کئے گئے ہیں

(۱) ڈاکٹر ایلن گارڈنر (Dr. Allan Gardiner) کے نزدیک دونوں کا ماخذ سینا کا رسم خط تھا

(۲) ماریس ڈیونانڈ (Maurice Dunand) کی رائے میں جنوبی سامی رسم خط بائبلس کے نیم تصویری رسم خط سے رشتہ رکھتا تھا۔ سبائی رسم خط میں اُنھیں ۸ نشانات بائبلس کے نیم تصویری رسم خط سے کلیتاً مشابہ نظر آتے ہیں اور ۳ کسی قدر۔ اُن کا یہ بھی کہنا ہے کہ اہل سبا نے صرف حروف کی شکلیں بائبلس کے رسم خط سے لے لیں اور اُن کی آوازوں کا تتبع نہیں کیا۔

(۳) ڈاکٹر ڈرنیگر (Dr. Diringer) کی رائے میں جنوبی عرب کے مہذب لوگوں نے جب شمالی سامی رسم خط سے واقفیت حاصل کی تو ان میں خود اپنا رسم خط ایجاد کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ اُن کے سامنے مصر اور میسوپوٹامیہ کے پیچیدہ رسوم خط بھی تھے اور شمالی سامی رسم خط بھی۔ اُنھوں نے آخرالذکر کو اپنی ایجاد کی بنیاد بنایا اور بعض نشانات دیگر ذرائع سے حاصل کئے مثلاً وہ علامات جو بدوؤں میں جانوروں پر امتیاز کے لئے بنائی جاتی تھیں (انھیں "وسم" کہتے ہیں)

ان میں سے نمبر ۱ مقبول ترین نظریہ ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جنوبی سامی کی ایجاد میں بائبلس کے نشانات اور بدوؤں کی امتیازی علامات سے فایدہ اُٹھایا گیا ہو۔

	جنوبی سامی	شمالی سامی
ج	⌐	1
ز	H	I
ط	⊟	⊕
ل	⌐	6
ن	⌐	1
ع	O	O
ق	⊖	Φ
ش	≤	W
ت	X	X

شکل نمبر ۱

یہ بات ابھی تک غیر واضح ہے کہ جنوبی سامی رسوم خط میں قدیم ترین کون تھا اور اُسکی ابتدائی صورت کیا تھی۔ میری فہم میں جب تک یہ دو باتیں یقینی طور پر طے نہ ہو جائیں جنوبی سامی کا سینا کے رسم خط سے متعلق ہونا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس مسئلہ پر روشنی ڈالنا ضروری ہے۔

علمائے مغرب کے نزدیک جنوبی سامی میں معینی اور سبائی قدیم ترین رسوم خط ہیں برخلاف اس کے مجھے لحیانی حروف کی شکلیں معینی اور سبائی سے زیادہ پرانی معلوم ہوتی ہیں (لحیانی کو جدید مانا جاتا ہے) مثال کے طور پر الف کو لیجئے اگر ہم اپنی قوت متخیلہ سے کام لیں تو معلوم ہوگا کہ جنوبی سامی میں الف پہلے ایسے لکھا جاتا ہوگا۔ الف کے معنی بیل کے ہیں اور یہ بیل کے سر کی تصویر ہے (سمیری اور بابلی میں بیل کا نشان اسی طرح بنایا جاتا تھا[1]) جب اسے جلدی بالغیر قلم اُٹھائے لکھا گیا تو یہ صورت حاصل ہوئی[2] پھر اس کا نیچے کا حصہ کسی قدر کھل گیا یعنی ایسے اور بعد میں اس کی ٹیڑھی لکیروں کو سیدھا کر لیا گیا اب اگر ہم ان اشکال کا شمالی سامی اور سینا کے نشانات سے مقابلہ کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ الف کی لحیانی شکل سبائی سے زیادہ پرانی ہے (دیکھئے شکل نمبر ۲)

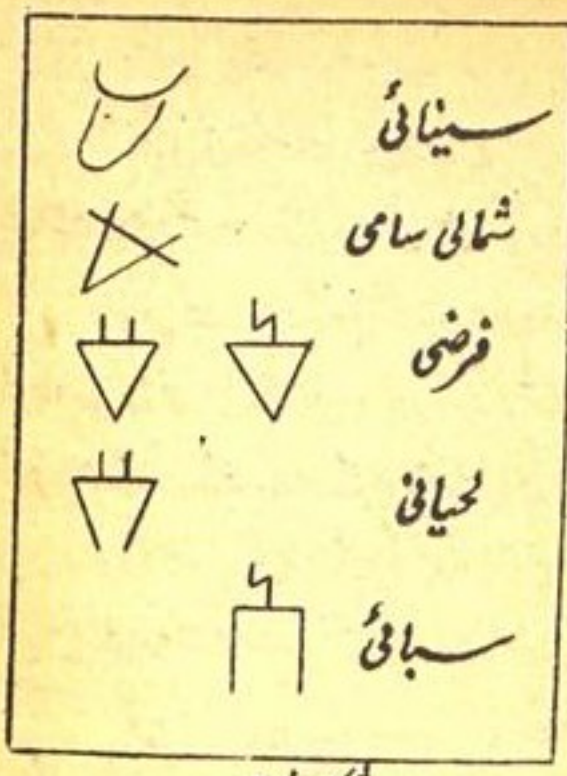

شکل نمبر ۲

جلدی لکھنے میں حروف کے بند حصے کھل جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ شمالی سامی میں حروف کے اوپری حصے کھل گئے ہیں برخلاف اس کے جنوبی سامی میں نیچے کے حصے کھلے ہوئے پائے جاتے ہیں، جیسے سبائی میں، لحیانی میں حروف بند ہیں (شکل نمبر ۳) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ لحیانی حروف کی شکلیں سبائی سے زیادہ پرانی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ پہلے جنوبی سامی میں حروف کے نیچے کے حصے کھلے ہوئے تھے اور بعد میں بند کر دئے گئے تو یہ چیز نہ صرف عام اُصول کے خلاف ہوگی (یعنی حروف پہلے بند ہوتے ہیں اور بعد میں جلدی لکھنے سے کھل جاتے ہیں) بلکہ اس کی تکذیب خود الف کی صورت سے ہوگی۔ الف کی یہ صورت اس سے زیادہ پرانی ہے۔

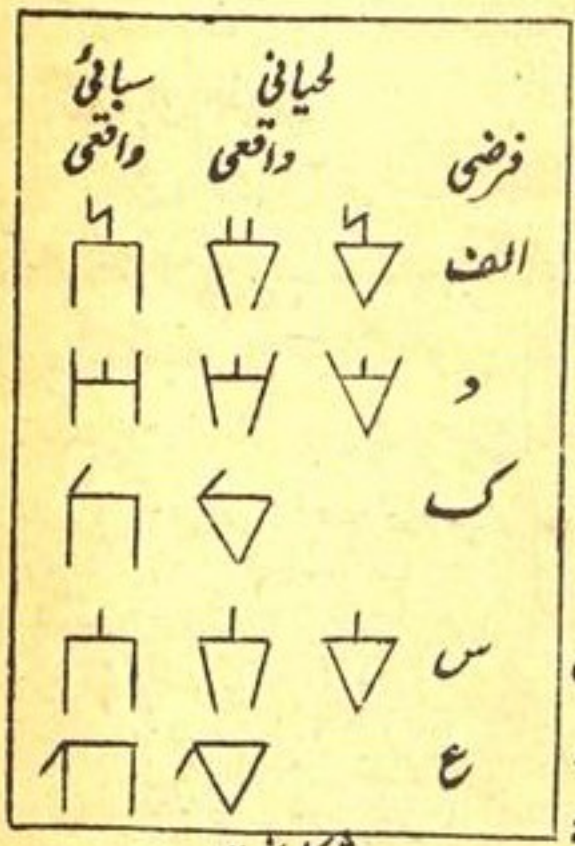

شکل نمبر ۳

عموماً کسی خط کی قدامت کا اندازہ اُس کے کتبوں سے لگایا جاتا ہے۔ جتنے پرانے کتبے ہوں گے اتنا ہی پرانا وہ خط ہوگا لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کسی خط کو ابتدائی دور میں ناپائیدار اشیاء (عرب میں چمڑا، ہڈی، کھجور کی پتیاں اور لکڑی وغیرہ) پر لکھا جاتا ہو اور پتھر یا دھات کی تختیوں پر لکھنے کا رواج بعد میں ہوا ہو۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ پتھر یا دھات کے کتبے تو باقی رہ سکتے ہیں لیکن خام اشیاء بہت جلد ضایع ہو جائیں گی ایسی حالت میں اگر ہم کسی قوم میں علم کتابت کا رواج اُس زمانہ سے متعین کریں جس زمانہ سے سنگی یا فلزاتی کتبے ملنا شروع ہوتے ہیں تو یہ غلطی ہوگی۔ اب اگر یہ صورت لحیانی رسم خط پر منطبق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ پہلے وہ ناپائیدار اشیاء پر لکھا جاتا تھا جو نیست و نابود ہو گئیں۔ بعد میں اُسے پتھر پر کندہ کیا جانے لگا۔ لحیانی کتبوں کے زیادہ قدیم نہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ رسم خط بھی زیادہ پرانا نہیں ہے۔ اس کی قدامت حروف کی شکلوں سے بخوبی ثابت ہے۔

میرا یہ بھی خیال ہے کہ لحیانی رسم خط میں شروع سے آخر تک بہت کم تبدیلیاں ہوئیں۔ اسی لئے جنوبی سامی حروف کی قدیم ترین صورتیں اس خط

---

[1] سمیری 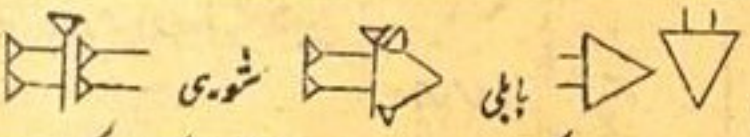 بابلی شوری تلفظ "الپو" (بمعنی بیل) اس کا "الف" سے مقابلہ کیجئے۔

[2] دو لکیروں ۱۱ کا جلدی لکھنے سے یہ صورت ۱۱ اختیار کر لینا ایک عام بات ہے۔ ہندسوں میں ۲ اور ۳ کے ارتقا سے اس کی تائید ہوتی ہے:

میں باقی رہ سکیں برخلاف اس کے سبائی اور دوسرے رسوم خط میں نسبتاً زیادہ تبدیلیاں ہوئیں۔

لحیانی کی قدامت اس سے بھی ثابت ہے کہ وہ العلا کے علاقہ میں مستعمل تھا جو معینی قوم کی ایک اتنی پرانی نوآبادی تھی کہ سبائی حکومت کے قیام سے پہلے موجود تھی اور خانہ بدوش اہلِ سبا وہاں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔

اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہے کہ وہ عالم جو سبائی سے لحیانی اور دوسرے خطوط کو ماخوذ مانتے ہیں کس قدر غلطی پر ہیں اور اگر اُن کے دعوے کو تسلیم کرلیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ شمالی عرب کے رسوم خط جنوبی عرب کے رسوم خط سے ماخوذ تھے لیکن سینا کے رسم خط کو شمالی اور جنوبی سامی رسوم خط کا ماخذ مان لینے کے بعد ہمیں جغرافیائی قربت کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جنوبی سامی رسم خط کی ایجاد شمالی عرب میں ہوئی ہوگی اور وہاں سے وہ جنوب کی طرف پھیلا ہوگا چنانچہ پروفیسر البرائٹ (Prof. Albright) کا کہنا ہے کہ جنوبی عرب سے زیادہ شمالی عرب کے کتبوں کے حروف سینا کے نشانات سے مشابہ ہیں۔

گرم (Grimm) کے مطابق ثمودی رسم خط شمالی عرب کا قدیم ترین رسم خط تھا جس سے سبائی اور دوسرے جنوبی سامی رسوم خط نکلے (وہ ثمودی کو سینائی خط کی ایک براہ راست شاخ سمجھتے ہیں) لیکن اس نظریہ کو اُن کے سوا کسی کی تائید حاصل نہیں ہے۔ بہرحال میرے اور اُن کے نظریے میں یہ بات ضرور مشترک ہے کہ شمالی عرب کے ایک رسم خط کو (گرم کے مطابق ثمودی کو میرے مطابق لحیانی) جنوبی سامی رسوم خط میں قدیم ترین مانا گیا ہے۔

میں نے لحیانی کی قدامت کو ثابت کرنے اور سبائی کا ارتقاء دکھانے کے لئے بعض "فرضی" حروف نقل کئے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ حروف کسی کتبے میں نہیں پائے جاتے لیکن چونکہ بغیر ان کے فرض کئے لحیانی اور سبائی کا ارتقاء سمجھ میں نہیں آسکتا اس لئے یہ بالکل ممکن ہے کہ یہ حروف بعض کتبوں میں پائے جاتے ہوں جن کا مجھے علم نہیں ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ حروف کی یہ فرضی شکلیں لحیانی میں نہ پائی جاتی ہوں بلکہ اُس سے پہلے کے کسی رسم خط میں پائی جاتی ہوں چنانچہ بعض علمائے مغرب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معلوم شدہ جنوبی سامی رسوم خط میں کسی کو بقیہ کا ماخذ نہیں ٹھہرایا جاسکتا بلکہ اُن سب کی اصل ایک نامعلوم قدیم ترین رسم خط (Proto South Semitic) تھا اسی طرح شمالی سامی رسوم خط کا ماخذ (Proto North Semitic) کو ٹھہرایا گیا ہے اور ان دونوں کی اصل (Proto Semitic) کو لیکن ان تینوں رسوم خط کی صورتوں کا علم ہمیں نہیں ہی ہم زیادہ سے زیادہ قیاس آرائی کرسکتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی سامی کے بعض حروف کو شمالی سامی حروف سے عمداً مختلف بنایا گیا تھا مثلاً (ملاحظہ ہو شکل نمبر ۴):-

شمالی سامی	جنوبی سامی	تلفظ و معنی
		ی (ہاتھ)
		ک (ہاتھ)
		ف (دہانہ)
		ش (دانت)
		م (پانی)

شکل نمبر ۴

(۱) ی کے لئے شمالی سامی میں کھلے ہوئے ہاتھ کی تصویر ہے اور جنوبی سامی میں بند مٹھی اور کلائی کی۔

(۲) ک کے لئے شمالی سامی میں کھلے ہوئے ہاتھ کی تصویر ہے اور جنوبی سامی میں بند مٹھی کی جس میں انگوٹھا نکلا ہوا ہے۔

(۳) جنوبی سامی کے ف (فم) کی صورت شمالی سامی سے زیادہ (دہانہ) کی تصویر ہے۔

(۴-۵) شمالی سامی میں تیم کو ش سے ممتاز کرنے کے لئے غالباً ایک لکیر بڑھائی گئی تھی جنوبی سامی میں بھی ایسا ہی کیا گیا لیکن ایک دوسرے انداز سے جس سے حروف کی شکلیں بالکل ہی مختلف ہوگئیں

جنوبی سامی کے بعض حروف ف، ش، م وغیرہ شمالی سامی کے برخلاف عمودی طور پر بنائے گئے تھے اور یہ چیز عراقی رسوم خط کی نقل ہوسکتی ہے۔ سمیری خط پہلے اوپر سے نیچے کو

لکھا جاتا تھا۔ بعد میں اُسے بائیں سے دائیں کو لکھنے لگے اور نشانات کو بجائے افقی کے عمودی طور پر بنایا جانے لگا۔ یہی طریقہ بابلی اور آشوری خط میں اختیار کر لیا گیا اور اسی کی نقل غالباً جنوبی سامی میں کی گئی (شکل نمبر ۵)

سمیری		جنوبی سامی	
عمودی	افقی	واقعی	فرخی
▷	▽	⟨	⟨
⌐	⌐	⟨	⟨
◇	◇	◇	◇

شکل نمبر ۵

جنوبی سامی کی ایجاد پر غور کرنے والوں نے عراقی اثرات کو نظر انداز کر دیا ہے لیکن یہ چیز نہ صرف بعض حرفوں کے عمودی پن بلکہ اس سے بھی نمایاں ہے کہ جنوبی سامی کے بعض کتبے حیوانی اور نباتاتی تصاویر سے آراستہ ہیں جو آشوری آرٹ کے اثر کو ظاہر کرتی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ رسوم خط کی ایجاد سے دلچسپی لینے والے حضرات ان امور پر غور فرمائیں گے۔

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

	صفوی	ثمودی	لحیانی	سبائی		صفوی	ثمودی	لحیانی	سبائی
ا					ل				
ب					م				
پ					ن				
ج					س				
د					ع				
ذ					غ				
ہ					ف				
و					ص				
ز					ض				
ح					ق				
خ					ر				
ط					ش				
ظ					ت				
ی					ث				
ک									

شعلۂ ندا

(ایک مکتوب بنام علامہ جمیل مظہری)

مکرمی و محترمی ، تسلیم و نیاز

آج مجھے ایک مجموعۂ کلام ملا ہے، جس کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ آپ کا تصور بھی سامنے آگیا اور جب میں کامل تین گھنٹوں کے مطالعہ کے بعد "درازِ نفسی" کی طرف مایل ہوا تو آپ کی یاد "عنان گیر ہوگئی - آپ شعلۂ ندا اور صاحب شعلۂ ندا دونوں سے واقف ہیں اس لئے پروفیسر اجتبیٰ رضوی کی شاعری پر گفتگو کرنے کے لئے آپ سے بہتر شخص اور کون ملے گا، جبکہ اس کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ کی یاد آہی جاتی ہے - آپ دونوں کی انفرادیت اپنی اپنی جگہ مسلم آپ دونوں کے کلام کا مزاج ایک ہے اور وہ چیز جو آپ دونوں کے یہاں مشترک ہے وہ بقول نیاز فتحپوری "صاحبانہ طرزِ فکر" ہے - رضوی کی شاعری کا ڈکشن (DICTION) اُردو شاعری کے مروجہ ڈکشن سے مختلف ضرور ہے لیکن یہ ڈکشن وہی ہے جو آپ کے کلام کی انفرادیت کا باعث ہے - آپ دونوں کی شاعری بڑی حد تک اُردو شاعری میں ایک نئے رجحان کا اضافہ کرتی ہے اور یہ رجحان عبارت ہے فکر و فن کی حسین و دلنشین ہم آہنگی سے - آپ دونوں کے یہاں شاعری، دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں کسی فاصلے کی تعیین کرنے نہیں آئی، بلکہ فکر و جذبے کے درمیان فاصلے کم کرنے آئی ہے -

ہمارے یہاں شاعری میں فلسفے کی بڑی بے آبروئی ہوئی ہے - دیکھا گیا ہے کہ جس شاعر نے فلسفیانہ طرزِ فکر اختیار کیا اور چل نکلا وہ اپنی پہلی شخصیت کو بھول جاتا ہے اور دوسری شخصیت کو خود پر مسلط کر لیتا ہے یعنی اس کے اندر سے "شاعر" تو کہیں کھسک جاتا ہے اور "فلسفی" در آتا ہے - کسی نے "فلسفے" کو شاعری کی معراج سمجھ لیا اور کسی نے "تصوف" کو راہِ نجات مان لیا اور اُردو شعر و ادب کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ اس معراج اور راہِ نجات کی ان کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی ہے اگر مصور "رنگ" کو "خاکے" سے زیادہ اہمیت دیدے تو اس کا نقشِ فریادی نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا - اولاً تو ہمارے یہاں شعرا تہذیبِ فکر کے سرے سے قایل نہیں اور جو ہیں انھوں نے اگر تفکر اور تخیل کو اپنایا تو احساس اور جذبے کو دل کی دنیا سے دیس نکالا دیدیا - میں نے کئی بار اپنے مقالوں میں اس بات پر زور دیا ہے کہ شاعری درحقیقت فکر اور احساس (INTELLECT & EMOTION) کے امتزاجِ لطیف کا نام ہے - بغیر فکر کے کوئی شاعر بڑا اور آفاقی شاعر نہیں ہوسکتا - اس کے حلقۂ تاثر میں ہمہ گیری نہیں آسکتی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ بغیر احساس کی دولت کے کسی شاعر کے یہاں، دردمندی آہی نہیں سکتی - غالب کے علاوہ جنھوں نے فلسفہ کو اپنایا انھوں نے اس کی قیمت شعریت سے ادا کی اور ظاہر ہے کہ اس میں گھاٹا ہی رہا - دل اور دماغ دونوں شاعر کے لئے یکساں اہمیت رکھتے ہیں جیسے ایک باپ کے دو بچے - ایک بچے کی پرورش کے لئے دوسرے بچے کی گردن کون باپ مارے گا لیکن دنیائے شاعری میں یہ خونِ ناحق ہوتا رہا ہے - کبھی فلسفہ کی خاطر اور کبھی تصوف کے لئے لیکن آپ نے شعر کی گردن پر خونِ دو عالم کی مشق نہیں کی ہے - مجھے اس پر اصرار ہے کہ اگر غالب کے رنگ و آہنگ کو کسی نے نباہا اور نکھارا ہے تو وہ آپ ہیں - آپ کے یہاں بھی کتابی فلسفہ نہیں بلکہ یہ وہ فلسفہ ہے جہاں دل و دماغ کا خون ایک جا ہو کر نطق شاعر سے بشکل الفاظ چھوٹ پڑتا ہے - احساس اور شدتِ احساس سے کوئی شخص عاری نہیں ہوتا لیکن فکر اور تہذیبِ فکر ہر کسی کے بس کی بات نہیں - اشعار کا بسیرا نہ تو شاعر کا دل ہے نہ شاعر کا دماغ بلکہ ان کا مسکن دل و دماغ کی سرحد ہے - پھر وہ فلسفہ ہو یا تصوف، معاشیات ہو یا عمرانیات، غرضکہ کلام اللہ سے لے کر

مارکس کی CAPITAL تک جو کچھ بھی ہو دنیائے شاعری میں زبان شعر ہی سے ادا ہونا چاہئے، برش (BRUSH) کا کینوس (CANVAS) کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اب دیکھئے نا اصغر مرحوم کہنے کو تو یہ کہہ گزرے کہ ؎

کبھی سنا کہ حقیقت ہے میری لاہوتی　　کہیں یہ ضد کہ ہیولائے ارتقا ہوں میں

اب ہم لوگوں کے لئے یہ اُلجھن پیدا ہوگئی کہ ہم الفاظ کے اس مجموعہ کو کیا کہیں۔ شعر میں فلسفیانہ طرز فکر اور بات ہے اور کسی فلسفیانہ نکتے کا بیان مقفیٰ اور بات۔ عقل و دانش کی کرنوں پر جذبات و احساسات کی پرچھائیاں نہ پڑیں تو شعر کیا ہوا۔ عقلی موشگافیاں خواہ کسی قدر خارجی کیوں نہ ہوں تمناؤں اور آرزؤں کے سائے ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ جذبے کو تو فکر کا لباس حریر سمجھئے۔ ننگ دھڑنگ فکر کس کام کی یقین کیجئے کہ فکر کبھی فن کا سہاگ بن جاتی ہے اور کبھی فن کا سوگ۔ جس نے اس فرق کو برتا وہ زندۂ جاوید ہوگیا شاعر کے پاس فلسفی کی نگاہ ضرور ہو لیکن فلسفی کی زبان نہ ہو۔ غالب کے یہاں یہی اثبات و نفی ہے جس نے اُسے "ولی" بھی بنا دیا اور "بادہ خوار" بھی۔ شعر اور فلسفہ میں کوئی بُعد یا بَیر نہیں۔ اگر فلسفہ زندگی کے مکمل اور جامع نظام کا نام ہے تو ادب زندگی کا اظہار ہے لیکن یہ اظہار دو اور دو چار کے قسم کا اظہار نہیں۔ فلسفے کی اصطلاحات کی جگہ شعر میں نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے لیکن حیات و کائنات کے متعلق "آپ بیتی" کے دائرے میں رہ کر شاعر کو آزادی ہے اور شاعرانہ لب و لہجہ میں سب کچھ کہہ دے، لیجئے آپ بھی کیا کہیں گے کہ میں نے یہ کون سا ذکر چھیڑ دیا۔ یہ خط ہے یا کالج کا لیکچر لیکن اب جبکہ ذکر چھیڑ گیا ہے تو اسے مکمل ہی ہونے دیجئے۔ جب قیامت کا ذکر چھڑ جاتا ہے تو بات کسی کی جوانی تک پہونچ جاتی ہے، اسی طرح جب شعر و فلسفہ کی بحث نکل آئی ہے تو اسے شعلۂ ندا تک پہونچنے دیجئے۔

شعلۂ ندا کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ رضوی کے کلام میں ایک خاص کیفیت ہے جسے ہم جذب و مستی کہہ سکتے ہیں۔ غزل ہو یا نظم رُباعی ہو یا قطعہ پورے مجموعے میں فکر کی ہم آہنگی ہے۔ اُردو شاعری میں جہاں ایک ہی سانس میں وصل و فراق کے عیش و غم کا ذکر کر دیا جاتا ہے رضوی کا کلام ایک نئی چیز ہے۔ ایک عالم ہے جو شروع سے آخر تک جاری و ساری ہے۔

میں نے کسی رسالہ میں پڑھا تھا کہ آپ نے تغزل کا معیار عرفی کے اس شعر کو مانا ہے ؎

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود　　بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

حقیقت بھی یہی ہے کہ نقادانِ غزل نے تغزل کے مفہوم کو بہت ہی محدود رکھا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ غزل تو لامحدود ہوگئی، لیکن مفہوم تغزل نہیں بدلا۔ آلام روزگار کو آسان بنا دینے کی حد تک ہر غم کو غم جاناں بنایا جا سکتا ہے لیکن بادۂ سخن کو دو آتشہ بنانے کے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ غم دوراں کو غم جاناں کے سبو میں ڈھال دیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ غم عشق کو بھی غم روزگار کے پیالے میں انڈیل دیا جائے۔ ہر غم کو غم جاناں بنا دینا آسان ہے لیکن غم جاناں کو اس حد تک وسیع کر دینا کہ وہ غم جہاں بن جائے ہر کسی کے بس کی بات نہیں اور یہی غالب نے کہا ہے کہنے کو تو غالب نے کہا تھا کہ :

غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا غم روزگار بھی وہی غم ہے جو حریم ناز سے کھبیں بدل کر انجمن عام میں چلا آیا ہے اور مجھے یہی احساس رضوی کے کلام کے مطالعہ سے ہوتا ہے :

اس حرص و ہوس کے میلے میں ہم جنس محبت لائے ہیں　　سب سستے مال کے گاہک ہیں یہ مہنگا سودا کون کرے

تجلّی بے نقاب اور کور آنکھیں کیا قیامت ہے　　کہ سورج سامنے ہے اور سیہ بختی نہیں جاتی

چمن اسے اتفاق کہہ لے گری تو ہے آشیاں پہ بجلی　　نہ دو قدم آشیاں سے پیچھے نہ دو قدم آشیاں سے آگے

ہم روتے ہیں اپنے پیاروں کو اور فطرت ہم سے کہتی ہے　　اب اور کھلونوں سے کھیلو جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

یہ غم غم ذات سے زیادہ غم حیات ہے۔ ایک بات اور ہے۔ جہاں بھی رضوی کے کلام میں غم و الم کا عنصر آیا ہے وہاں حبس یا گھٹن کی فضا پیدا نہیں ہونے پائی نہ نالہ و گریہ ہے نہ آہ و بکا ہے نہ دم گھٹتا ہے نہ جان نکلتی ہے بلکہ ایک کسک بل ہر جگہ ہے۔ شاعر کے لبوں پر ایک تبسم سا آجاتا ہے اور

یہی تبسم سب کچھ ہے۔ تنقید، طنز، بے نیازی، بے اطمینانی، بیزاری جو کہہ لیجئے۔ یہ سب کہتے آئے ہیں کہ غم حیاتِ انسانی کا لازمی جزو ہے لیکن اس مہتم بالشان تبسم کو کس حسن کے ساتھ دو مصرعوں میں بیان کر دیا گیا ہے ؎

ہے روح کی حالت کندن کی جتنا ہی تپے گی نکھرے گی　　غم ایک کسوٹی ہے جس پر یہ فطرت ہم کو کستی ہے

رضوی کے فکر کا سفر شروع تو حکمت سے ہوتا ہے لیکن اس سفر کی منزل حیرت ہے۔ ان رباعیوں کو دیکھئے :

احساس کی ہے داستاں یہ بھی غلط،　　ذہنوں کی جو دولت ہے گماں یہ بھی غلط
حکمت کو ہے اعتبارِ تقدیرِ نظام،　　حیرت ہے وہ عالم کہ جہاں یہ بھی غلط

نظارہ نظر کی بے خودی کا عالم،　　ادراک سکوتِ حیرتی کا عالم،
بس ایک ربودگی نہ جلوہ نہ نگاہ،　　اللہ اللہ آگہی کا عالم،

دیکھا آپ نے فلسفۂ حیات کی تان کہاں ٹوٹتی ہے۔ حیات کی تمام نور افشانیاں اور جلوہ و نظارہ کی ساری تجلیاں ایک بحرِ ظلمات کی طرف دوڑتی نظر آرہی ہیں۔ رضوی کے مطالعۂ حیات و کائنات میں طالب و جستجو کی تشنگی کبھی نظر نہیں آتی۔ غالب کے مشہور قطعے کے بعد رضوی کا یہ قطعہ دیکھئے۔ غالب تو ابرو ہوا، سبزہ و گل اور عشوہ و ادا، ہی میں الجھ کر رہ گئے دیکھئے رضوی کہاں کہاں پہونچتے ہیں ؎

یہ اتحادِ طبیعت یہ اختلافِ مزاج　　یہ طرفہ کاریِ رفتارِ ارتقا کیا ہے
خدا فروشیِ زہاد، سجدہ کوش ہے کیا　　خدا فراموشیِ رندِ کج ادا کیا ہے
خراشِ آرزوئے قلبِ بادشاہ ہے کیا　　سکونِ خاطرِ آسودۂ گدا کیا ہے
حیات جس کو کہیں اک جنونِ گرم روی　　یہ کیوں ہے اس کی غرض اسکا مدعا کیا ہے
کہاں ہے اوّلِ اوّل، کہاں اخیرِ اخیر　　نمود بے سر و پا کا یہ سلسلہ کیا ہے

جو شاعر فکر و فن کا قایل ہوتا ہے اس کی ساری شاعرانہ زندگی محض طلب و جستجو ہوتی ہے۔ وہ وادیِ حیات سے ایک عالم وجد و سرشاری میں خار و گل دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے گزرتا چلا جاتا ہے۔ اسے ناصح و زاہد یا رہبر و مصلح بننا نہیں آتا وہ تو اپنے مشاہدات و تجربات کی تمین قندیلیں جلاتا چلا جاتا ہے جو رہِ نوردانِ راہِ محبت اور مسافرانِ راہِ ارتقا کو راہ دکھاتی ہیں۔ رضوی کا کلام انھیں قندیلوں سے روشن ہے انھوں نے زندگی یا زندگی کے کسی مسئلہ پر کوئی حکم نہیں لگایا ؎

مجھے کچھ تجربے ہر رنگ کے جھولی میں رکھ لینا　　مسافر ہوں غرض کیا ہے مجھے صحرا و گلشن سے

اور یہ مسافر اس کاروانِ حیات میں خود کو بالکل اجنبی اجنبی اور کٹا کٹا سا محسوس کرتا ہے۔ وہ تو اپنی بصیرت کی آگ میں جھلستا رہتا ہے لیکن دوسروں کو اس کی آنچ کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ وہ ذہنی و قلبی طور پر اس قدر بیدار ہوتا ہے کہ جرس کارواں کے بجنے سے بہت پہلے نشانِ منزل اس کے دل و دماغ میں جلوہ گر ہو جاتا ہے :-

تم سے رضوی کئی منزل ہے زمانہ پیچھے　　راہرو اس کو کہو راہ نما جس کو کہیں

کچھ تو یہ احساس مارے ڈالتا ہے کہ تو کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں، - اور کچھ اس قسم کی "روشنیِ طبع" ؎

مجھے ہر کارواں سے چھوٹنا اس بدگمانی میں　　کہ شاید راہبر کو ربطِ پنہانی ہو رہزن سے
ہمارے خوف کی خلاقیاں خدا کی پناہ　　وہ بجلیاں ہیں نظر میں جو آسماں میں نہیں،

نتیجہ ظاہر ہے۔ "زندگی بلاشد" والا معاملہ ہے۔ یہی اندیشے ہر صاحبِ فکر و نظر کو مارے ڈالتے ہیں اور وہ ساری عمر یقین و گمان کی الجھنوں میں گرفتار رہتا ہے لیکن اس سے "خود کردہ را علاجے نیست" کا احساس بھی الگ نہیں ہوتا اور اسی مقام پر اس کے بازوئے پرواز سمٹ جاتے ہیں لیکن یہی احساسِ تاسف شاعر کے ہر کفر کی وکالت کرتا ہے اور پھر اس کی شخصیت ایک معصوم و سادہ لوح و متجسس فرشتے کی

سی ہو جاتی ہے جو ایک انجانی سی راہ پر چل نکلا ہے اور نتیجتاً ٹھوکریں کھا رہا ہے ؎

جلوے کی بھیک دے کے وہ ہٹنے لگے تھے خود — دامن پکڑ لیا نگہِ اعتبار نے
طلب کی ذلت و بیچارگی معاذاللہ — مری خودی کا تشنج ہے یہ دعا کیا ہے

میرا خیال ہے کہ یہی "احساسِ شکست" آپ کے کلام میں بھی جا بجا جلوہ گر ہے۔ اگر رضوی کو اس کا رونا ہے کہ ؎

ہم تخمِ محبت سینے میں جنت سے چرا کر لے آئے — اس ریت میں کیا اگتا وہ بھلا ہاں لائے تھے بونا ہی پڑا

تو آپ پابندِ بزم کے مارے ہوئے ہیں ؎

دیتے ہی کہا تھا ساقی نے اس جام میں ہے تلخیِ خرد — پھر مانگ کے واپس کرنے کا موقع ہی نہ تھا پینا ہی پڑا

خیر اب یہ فلسفہ وغیرہ برطرف، واقعہ یہ ہے کہ رضوی کے کلام میں حکمت و بصیرت ہی نہیں بلکہ ان کے دردمند دل کی بھی جلوہ نمائی ہے جہاں دل ہی دل کی کارفرمائی ہے وہاں بھی دیکھئے کہ طرزِ بیان میں انفرادیت ہے یا نہیں۔ تاثیر کا جہاں تک سوال ہے یہ بیان کرنے سے زیادہ محسوس کرنے کی چیز ہے ؎

انسان کو دل ملا مگر کیا — اندھے کے ہاتھ میں دیا ہے

دل کی دھڑکن جو ہے مدارِ حیات — اک ذرا تیز ہو تو آفت ہے
زباں سے دل کا فسانہ ادا کیا نہ گیا — یہ ترجماں تو بنی تھی مگر بنا نہ گیا

رضوی کے یہاں "صاحبدلانہ طرزِ فکر" کے ساتھ ہی ساتھ محسوسات کا بے ساختہ و بے تکلف بیان بھی ہے۔

جہاں تک رضوی کی نظموں کا تعلق ہے ان کی نظمیں ندا، ترانۂ آدم، تقدیرِ آدم اور فریادِ آدم ایسی ہیں جن کو کلام رضوی کی مکمل نمایندگی کا حق حاصل ہے۔ ان میں رضوی کا اپنا رنگ و آہنگ ہے۔ ان نظموں میں بازیِ گرِ بندرابن، البیلے جلوے اور سجدہ کو بھی شامل کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ رضوی نے جو کچھ کہا ہے ان نظموں میں وہ انفرادیت نہیں۔ مثلاً "مہاتما گاندھی کی یاد میں" کے عنوان سے جو نظم ہے وہ محض ایک موقع کی نظم ہے۔ اس میں وہ شدتِ احساس نہیں بلکہ یکسر جوش کا رنگ ہے۔

برخلاف اس کے آپ نے مہاتما گاندھی پر جو نظم کہی ہے وہ بلا کی دردمندانہ شدتِ احساس سے بھرپور ہے۔ اسی طرح رضوی نے نہرو پر یا آزاد پر جو نظمیں کہی ہیں وہ محض رسمی محبت و عقیدت کا نتیجہ ہیں۔ یہی حال ان کی نظم ہلالِ عید کا ہے۔ یہ تمام نظمیں رضوی کے کلام میں "آورد" کی حیثیت رکھتی ہیں جہاں جہاں رضوی روحانیت کے زیرِ اثر ہیں ان کے کلام میں شدت و انفرادیت سبھی کچھ ہے اور جہاں کہیں وہ سامنے کی چیزوں پر کچھ کہنے لگتے ہیں تو ان کا مزاج اُن کے موضوع سے گریزاں گریزاں سا محسوس ہوتا ہے۔

رضوی کے کلام میں انفرادیت ہے اور ضرور ہے لیکن کبھی کبھی ان کا فلسفیانہ مزاج اور ان کے فکری تیور ان کے لب و لہجہ کو مغلوب کر دیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صفائی و روانی اور دلنشینی و شیرینی رخصت ہو جاتی ہے اور نگارِ شعر پر بوڑھاپا طاری ہو جاتی ہے۔ اُن کو اظہار مدعا کے لئے کبھی کبھی دور از کار اندازِ بیان اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہ اہتمامِ بیان بہت نمایاں ہو جاتا ہے مثلاً ؎

جس راہ میں پیچ و خم نہیں ہے — اس راہ میں کیوں حرم نہیں ہے

اس شعر میں اضافتیں نہ سہی، ظاہری کوئی اشکال بھی نہیں لیکن مفہوم جس طرح ادا کیا گیا ہے اس میں ایک تکلف ضرور ہے مطلب کہنے کا صرف یہ ہے کہ راہِ حرم پیچیدہ ہے اور بس۔

بھلا اتنا بھی عریاں جلوہ دار زاں نظر ہونا — حجاب اندر حجاب آغوشِ ارماں کر دیا ہم نے

اس شعر میں بھی وہی بات ہے۔ اب یہاں دیکھئے کس قدر تکلف ہے ؎

بازار میں آ کر ناداں دل منظر کے کھلونوں پر مچلا — اور پیرِ خرد کو کاندھے پر انبارِ نظر ڈھونا ہی پڑا

نظم "تقدیرِ آدم" کے اشعار دیکھئے۔ اس نظم میں دو ہی چار مقامات ایسے ہوں گے جن کی بنا پر اسے اُردو کہہ سکتے ہیں ؎

یہ اضطراب مسلسل یہ جست و خیز و نمود　　یہ ایک جنبشِ باقی امینِ بود و نبود،

یا پھر ان مصرعوں کو دیکھئے:

ع　جلوہ آبادِ تصور بہ اداکاریِ شوق

ع　تجھے کس کس طرح لے نقطۂ مایوسیِ بنیش

یہاں رضوی پر غالب کا اثر ہے لیکن یہ مثالیں ان کے یہاں زیادہ نہیں۔ رضوی کی زبان مجموعی اعتبار سے خاص صفائی و دلکشی کی حامل ہے اور ان کا رنگ بالکل شاد کا رنگ ہے۔ طویل بحروں میں بھی اور خفیف بحروں میں بھی ان کے یہاں شاد کے تیور ملتے ہیں مثلاً:

شرع کی قیل و قال سنی افسانۂ وجد و حال سنا　　ذہن کی وہ عیاشی ہے اور روح کی یہ عیاشی ہے

تہمتِ کعبہ آپ نے لی بدنام کلیسا آپ ہوئے　　طور پہ بجلی قصر میں شیریں نجد میں لیلیٰ آپ ہوئے

چھیڑا ہی کیوں ہوائے رہِ کوئے یار نے　　اندھیر کر دیا مری مشتِ غبار نے،

زباں زباں ہوئی آخر کسے یہ تھا معلوم　　کہ میری آپ کی بات اتنی مشتہر ہوگی

میں نے بیدل کا مطالعہ نہیں کیا لیکن جتنا کچھ بیدل کے کلام کی خوبیوں کے بارہ میں ضمنی طور پر نیاز فتحپوری اِدھر اُدھر لکھتے رہے ہیں اسی کے پیشِ نظر نیاز کی اس بات سے بلا تامل اتفاق کرنے کو جی چاہتا ہے کہ رضوی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بیدل کو شاد کی زبان میں پیش کیا ہے لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہ آسکی کہ شعلۂ ندا کے ناشر جناب سید حسین احمد صاحب نے یہ کیونکر لکھدیا کہ غالب اور شاد کے ساتھ رضوی اقبال سے بھی متاثر ہیں۔

مجھے رضوی آپ سے قریب نظر آتے ہیں اور وہ اس لحاظ سے کہ ان کا APPROACH آپ ہی کا سا ہے۔

رضوی سے　مری محبت کی انتہا تھی مرے تخیل کی بت تراشی　　بکھر گئی آرزو کی پونجی طلسم ٹوٹا جو رنگ و بو کا

مظہری سے　بنا کے اک جنتِ تخیل طلسم باندھا تھا رنگ و بو کا　　لگائی دُنیا نے ایسی ٹھوکر اُچٹ گیا خواب آرزو کا

لیکن فرق یہ ہے کہ آپ کا لب و لہجہ کسی جگہ بھی فلسفیانہ نہیں ہے بلکہ کمبیر شاعرانہ ہے اور رضوی کی گفتار کبھی کبھی شعریت کو قدرے آگے بڑھا دیتی ہے۔

ارشد کاکوی

مذہبی حقایق

اگر آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں

تو　"من و یزداں"

اور

مذہبی استفسارات و جوابات

کا مجموعہ طلب فرمائیے

دونوں کی رعایتی قیمت معہ محصول بارہ روپیہ ہے۔　منیجر نگار

تقدیر اور گردشِ کواکب

یا

جاذبیت عامہ اور علمِ نجوم

مصر کے ایک فاضل حنا اسعد فہمی نے ایک کتاب "علم التنجیم" کے عنوان سے عربی زبان میں لکھی ہے۔ اس کے مقدمے میں فاضل مولف نے تقدیر و اسباب کے مسئلہ پر ایک نہایت دلچسپ بحث کے بعد یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ عالمِ کائنات کا ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک ہر واقعہ اسباب کے غیر قابل تغیر سلسلہ سے وابستہ ہے اور سارا نظامِ عالم، اسباب کے تحت واقع ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ فاضل مصنف نے استخراج نتائج میں کہیں غلطی نہیں کی ہے، لیکن جس خوبصورتی کے ساتھ اس نے اپنے مقصد کو ثابت کرنا چاہا ہے وہ یقیناً مستحق داد ہے، فاضل مصنف لکھتا ہے کہ:

"اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اُن واقعات و حوادث پر غور کریں جو رات دن ہر شخص پر گزرتے رہتے ہیں تو بظاہر ہم کو یہ معلوم ہوگا کہ تمام افرادِ انسانی ایک ایسے زبردست اور غیر قابل تغیر قانون کے زیرِ اثر پائے جاتے ہیں جن سے وہ سرمو انحراف نہیں کر سکتے، یعنے وہ مجبور ہیں کہ اسی قانون تقدیر کے تحت وہ کوئی سعادت حاصل کر سکیں یا بدبختی و شقاوت کا شکار ہو جائیں، بعض لوگوں کی حالت دیکھ کر ہم حکم لگاتے ہیں کہ ان کے حصہ میں سوائے مصیبت اور تکلیف کے کچھ نہیں ہے، قسام ازل نے سوائے مصائب کے ان کو کچھ نہیں دیا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ مصیبت سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تمام مساعی بے سود اور اُن کی تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہوتی ہیں کیونکہ تقدیر کا آہنی پنجہ نہایت سختی سے اُن پر اپنی گرفت جمائے ہوئے ہے۔

تم دیکھو گے بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں، جو مسرت و راحت کے نام سے آشنا تک نہیں اور بعض ایسے خدا کے بندے بھی ہیں جو نہایت کامیاب زندگی بسر کر رہے ہیں اور وہ کیسی ہی غلطی کیوں نہ کریں مگر اس کا انجام اُن کے حق میں بہتر ہی نکلتا ہے۔

بولیفر اطیس ایک شخص تھا جس نے کبھی تکلیف، مصیبت اور نقصان کا منہ نہیں دیکھا تھا، ایک روز اس نے چاہا کہ وہ اپنے کو خود نقصان پہونچائے، چنانچہ اس نے اپنی انگوٹھی جس میں لاکھوں روپے کے جواہرات جڑے ہوئے تھے سمندر میں ڈالدی، تھوڑی دیر کے بعد مچھلیوں کے شکاری ایک مچھلی اس کے گھر لائے، نوکروں نے اُن سے مچھلی خرید لی، جب وہ مچھلی کو صاف کرنے لگے تو اس کے پیٹ میں انھیں اپنے آقا کی انگشتری مل گئی کیونکہ جب اس نے انگشتری سمندر میں ڈالی تھی تو یہ مچھلی اس کو نگل گئی تھی، نوکروں نے وہ انگشتری فوراً آقا کی خدمت میں پیش کر دی۔

ان مسایل کو سمجھنے سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ مسرت و سعادت موقوف ہے، صحت، دولت، شہرت اور لذایذ جسمانی وغیرہ پر اور مشکل سے یہ تمام باتیں کسی ایک فرد میں جمع ہوتی ہیں، اس لئے سعادتمند وہی شخص سمجھا جاتا ہے جس کے پاس اسبابِ سعادت دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پائے جائیں۔ مگر ایسے افراد دُنیا میں کم ہیں جنھیں اسبابِ سعادت اسبابِ مصیبت سے زیادہ ملے ہوں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زید کے پاس مال و دولت کی کچھ کمی نہیں لیکن وہ ہر وقت رنجیدہ رہتا ہے، کیونکہ وہ ہر وقت خاندانی جھگڑوں میں مبتلا ہے، ایک شخص ہے جس کو سب لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور نہایت ذلیل طبقہ میں شمار کرتے ہیں، مگر وہ ایسا صحیح و توانا ایسا مسرور و بے فکر ہے کہ سب کو اس کی حالت پر رشک آتا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایک جاہل اور کمینہ شخص قوم کا سردار بن گیا ہے اور ایک شریف عالم کی تمام عمر

فاقہ کشی اور مصائب میں بسر ہوئی۔

اس قسم کے تمام واقعات کو دیکھتے ہوئے ہم یہ حکم لگاتے ہیں کہ ایک غیبی موثر ضرور ہے جو ہر شخص کا مستقبل معین کرتا ہے، اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ وہ موثر کیا ہو سکتا ہے، وہ لوگ جو اپنے مذہب پر نہایت رسوخ کے ساتھ قایم ہیں، اُن کو یقیناً اس اعتقاد سے تسلی ہوتی ہے کہ قدرت الٰہی ہمارے امور کی مدبر ہے، وہی مصلحت کے مطابق رنج و مصیبت تقسیم کرتی ہے اور اس تقسیم میں استحقاق اور خداوندی مصلحت دونوں ممزوج ہوتے ہیں۔

ہم کسی دینی عقیدہ کا انکار نہیں کرتے، ہم عالمِ روحانی کے منکر نہیں ہیں اور نہ ہمیں عالمِ آخرت اور وہاں کے ثواب و عقاب میں شک ہے لیکن ہم کو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جو واقعات انسان پر گزرتے ہیں اُس میں عدالت کا بالکل دخل نہیں ہے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک کوشش کرنے والا اپنے نتیجۂ عمل سے محروم نہیں رہتا لیکن یہ کوئی عام قاعدہ نہیں ہے بلکہ بسا اوقات ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک محنتی شخص کو سوائے ناکامی اور محرومی کے کوئی ثمرہ نہیں ملتا اور اسی کی محنت سے ایک سست و کاہل شخص فایدہ اُٹھاتا ہے، چنانچہ تاریخ کے دیکھنے سے متعدد ایسے واقعات مل سکتے ہیں کہ کسی مخترع نے عمر بھر کی کوششوں کے بعد ایک نہایت مفید چیز اختراع کی اور اس کے بعد ہی وہ فوراً مر گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خود اس سے کوئی فایدہ نہ اُٹھا سکا اور دوسرے لوگوں نے اس سے شہرت و دولت حاصل کی۔

اکثر دولت و ثروت مستحقین کے پاس سے بھاگتی ہے، حالانکہ وہ دولت انہی کی سعی اور اجتہاد سے پیدا ہوئی ہے اور ایسے لوگوں کے پاس خود بخود پہونچ جاتی ہے جنھیں نہ اس دولت کی ضرورت ہے نہ انھیں اس سے فایدہ اُٹھانے کا سلیقہ، یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پاک دل اور نیک نیت افراد سے لوگ بغض رکھتے ہیں اور انھیں نقصان پہونچانے کے درپے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ بعض وقت اُن کی جان تک نہایت بے رحمی سے لے لیتے ہیں اور بعض ایسے افراد جو خبث باطن اور نجاست اخلاق میں اپنی نظیر نہیں رکھتے نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ان کی مجلس میں ایک لمحہ کے لئے بیٹھنا بھی سعادت دارین سمجھتے ہیں، یہ اُن لاکھوں اور کروروں واقعات میں سے چند مثالیں ہیں جو رات دن ہمارے سامنے گزرتے رہتے ہیں، کیا ان تمام حوادث کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ہر واقعہ عدالت اور مصلحت پر مبنی ہے؟

نفوس عالیہ خیال کرتے ہیں کہ کامیابی ایک قومی ارادہ کے تحت قایم ہے یعنی حوادث اسی ارادہ کے تحت میں واقع ہوتے رہتے ہیں اور یہی ارادہ ہر شخص کو اس کا حصۂ خیر و شر تقسیم کرتا رہتا ہے، لیکن اس مسئلہ پر نظرِ تحقیق ڈالنے سے پہلے مختلف ارادوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔

یہ بالکل درست ہے کہ اصل چیز انسان کا ارادہ ہے کیونکہ اس کی بنیاد علم و ادراک پر ہے اور اسی کے ذریعہ سے انسان اپنے مستقبل کو سمجھ سکتا ہے اور اُن قوتوں کو پہچان سکتا ہے، جو اس کی سعادت مستقبلہ کی کفیل ہو سکتی ہیں، لیکن ارادہ بسا اوقات جہل پر مبنی ہوتا ہے اور اسی لئے ایسی شخص کی مثال بالکل اس آدمی کی طرح ہے جو رات کی شدید تاریکی میں چل رہا ہو اور اس کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ اپنا قدم کہاں رکھ رہا ہے اور اس کا یہ سفر کس راحت یا مصیبت کی طرف لے جا رہا ہے، یا ایسا شخص اس بچہ کی طرح ہے جس کو اس موٹر میں سوار کر دیا جائے اور وہ موٹر کے آلات سے بالکل ناواقف ہو، موٹر میں تمام پُرزے موجود ہیں جن سے وہ آہستہ اور تیز کیا جا سکتا ہے، روکا جا سکتا ہے، لیکن اس بچہ کو اس کی کچھ خبر نہیں ہے۔

پھر کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ بچہ اپنے ارادہ میں آزاد ہے اور اس نے اپنی عقل و ارادہ کی بنا پر اس پُرزہ کو حرکت دی تھی جس سے وہ ہلاک ہو گیا یا بچ گیا بالکل یہی حال ہم لوگوں کا ہے، بظاہر ہم اپنے اعمال اور افعال میں آزاد نظر آتے ہیں۔ لیکن ان اعمال کے نتائج اور اثرات کیا ہوں گے، اس کی ہم کو مطلق خبر نہیں اس مسئلہ کی توضیح و تفصیل کے لئے ہم چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

ایک نوجوان نہایت بے فکری اور اطمینان سے اپنے دفتر کی طرف جا رہا ہے، راستہ میں ایک جگہ ایسی آتی ہے جہاں دو راستے ہو گئے ہیں اور وہ دونوں اس کے دفتر تک پہونچتے ہیں، کبھی وہ داہنے راستہ سے جاتا ہے اور کبھی بائیں راستہ سے، آج وہ حسب معمول دفتر جا رہا ہے، بظاہر اس میں کوئی اہمیت نہیں کہ وہ کس راستہ کو اختیار کرے، مگر حقیقت میں آج اس کے مستقبل کا مدار اسی معمولی بات پر ہے کیونکہ اگر وہ داہنا راستہ اختیار کرے گا تو نہایت آرام سے دفتر پہونچ جائے گا اور راستہ میں کوئی مصیبت نہ پیش آئے گی، لیکن اگر وہ بائیں راستہ پر جائے گا تو اسے ایک نوجوان لڑکی ملے گی جس کی ایک تبسم آمیز

نگاہ اُس کا شکار کرلے گی، پہلے اس سے گفتگو ہوگی، پھر ملاقات کا مقام اور وقت مقرر کیا جائے گا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ ان دونوں میں محبت بڑھنے لگے گی، اُسے اپنی محبوبہ کی فرمائشیں پوری کرنے کے لئے روپیہ کی ضرورت ہوگی، جب اُسے کوئی قرض نہ دے گا تو وہ مجبور ہوکر دفتر میں ایک جعل کرکے سرکاری روپیہ اپنی ضروریات میں صرف کرے گا، تھوڑے دنوں میں اس کا جعل کھل جائے گا۔ وہ پکڑا جائے گا اور وہ سزا کی رسوائی سے خودکشی کرلے گا۔

اس کے والدین کو اس کی ذات سے کس قدر توقعات وابستہ تھیں، انھوں نے اس کی تعلیم و تربیت میں کتنی دولت صرف کی تھی، لیکن یہ تمام کوششیں رائگاں ثابت ہوئیں، تمام واقعات پر پانی پھر گیا، کیونکہ اس نے بجائے داہنی طرف کے بائیں طرف کا راستہ اختیار کیا تھا۔

(۲) ایک نوجوان مدرسہ میں تعلیم پاتا ہے اس کے والدین چاہتے ہیں کہ وہ علم ہندسہ میں کمال حاصل کرے اس کو کسی خاص فن سے ذوق نہ تھا، مگر اُس نے اپنے والدین کے منشا کے مطابق علم ہندسہ کو حاصل کرنا شروع کیا۔ ایک روز وہ قبل از وقت مدرسہ سے نکلا، چند دوستوں کے ساتھ اُسے تفریح کے لئے کہیں جانا تھا، وہ راستہ پر چل رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ایک گاڑی آرہی ہے جس کو دو گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ گھوڑے نہایت دُبلے ہیں اور گاڑی بہت وزنی ہے وہ اُسے کھینچ نہیں سکتے اور آہستہ آہستہ چل رہے ہیں گاڑی والے کو غصہ آیا اور اس نے گھوڑے کو کوڑا مارا، گھوڑا کود کر اسی طرف آیا جس طرف وہ چل رہا تھا وہ سڑک کی دوسری طرف ہوگیا، اس نے دیکھا کہ سامنے سے مدرسہ کا مہتمم آرہا ہے چونکہ وہ مدرسہ کی مخصوص وردی میں نہ تھا، اس لئے مہتمم کے خوف سے پاس کی ایک گلی میں چھپ گیا، وہاں دیکھا کہ اس کا باپ چند دوستوں کے ساتھ عدالت میں مقدمہ کی کارروائی سننے کے لئے جارہا ہے، مجبوراً اس کو بھی باپ کے ساتھ عدالت جانا پڑا چونکہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہ جاسکا، اس لئے اس کو بڑا رنج ہوا، جب وہ عدالت میں پہونچا اور اس نے وکیلوں کی تقریریں سنیں تو فنِ خطابت اور تقریر کی سحرکاریاں دیکھ کر اس کو قانون سیکھنے کا شوق پیدا ہوگیا اور اس میں اس نے اس قدر زبردست محنت کی کہ وہ وکیل ہوگیا۔ لاکھوں روپیہ اس نے کمائے اور بڑی عزت و شہرت حاصل کی، غور سے دیکھئے تو اس کا سبب صرف گاڑی والے کا اپنے گھوڑے کو کوڑے مارنا تھا، نہ وہ کوڑا مارتا نہ وہ نوجوان راستہ بدلتا، نہ اس کو مدرسہ کا مہتمم نظر آتا نہ وہ اس کے خوف سے گلی میں جاتا نہ اس کا باپ ملتا اور نہ وہ اس کے ساتھ عدالت میں جاتا نہ اس کے دل میں قانون کا شوق پیدا ہوتا اور نہ وہ قانون دانی میں یہ مرتبہ حاصل کرتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص سے ایک فعل صادر ہوتا ہے، جس کا اثر صرف اُسی شخص کے مستقبل پر نہیں پڑتا بلکہ اچھے یا بُرے نتائج سے ایک عظیم الشان جماعت متاثر ہوجاتی ہے۔ مثلاً:

راستہ پر ایک گاڑی جارہی ہے جس میں ایک نوجوان ایک عورت کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے، باہم محبت آمیز باتیں ہورہی ہیں۔ یہ دونوں اپنی باتوں میں اس قدر منہمک ہیں کہ انھیں کسی کا خیال نہیں ہے، اتفاق سے اسی وقت سامنے سے اس عورت کا شوہر آرہا ہے جو اس قدر بدمزاج ہے کہ اگر ان دونوں کو دیکھ لے تو فوراً ہلاک کردے، ایک دوسرا شخص سڑک کے کنارے کنارے نارنگی چھیلتا ہوا آرہا ہے اور اس عورت کے شوہر سے متصادم ہوجاتا ہے، یہ دونوں لڑنے لگتے ہیں اور گاڑی گزر جاتی ہے نہ وہ عورت اپنے شوہر کو دیکھتی ہے، نہ اس کا شوہر اپنی بیوی کو غیر کی معیت میں دیکھتا ہے اور اس طرح یہ مجرم عورت نجات پاجاتی ہے، لیکن واقعہ اسی حد تک محدود نہیں رہتا، جہاں اس شخص نے نارنگی چھیلی تھی، اس کے سامنے سلطنت کے وزیر اعظم کا مکان تھا وہ ایوانِ پارلیمنٹ میں جانے والا ہے، سواری اس کے لینے کے لئے آتی ہے، وزیر اعظم کا دماغ ایک نہایت ہی اہم سیاسی مسئلہ کے سوچنے میں مصروف ہے اور رات بھر کے غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ بغیر جنگ کئے ہوئے مقصد حاصل نہیں ہوسکتا اور چونکہ اس مسئلہ کا انحصار صرف اس کی رائے پر تھا، اس لئے آج اعلان جنگ بالکل یقینی تھا وہ اپنے خیال میں منہمک گھر سے باہر نکلتا ہے اور جب وہ اپنے موٹر کے قریب پہونچتا ہے تو اس کا پاؤں اُسی نارنگی کے چھلکے پر پڑتا ہے، چونکہ سڑک پختہ ہے، اس لئے اس کا پاؤں پھسل جاتا ہے اور وہ زمین پر گر کر بیہوش ہوجاتا ہے، اب بجائے ایوانِ حکومت کی طرف جانے کے، اُسے لوگ گھر لے جاتے ہیں، چونکہ سر میں سخت چوٹ آئی ہے، اس لئے وہ عرصہ تک بیمار رہتا ہے اور آخر میں وہ مرجاتا ہے۔ بظاہر نارنگی کا چھلکا نہایت بے حقیقت چیز ہے، لیکن محض اسی کی وجہ سے دُنیا جنگ کے مصائب سے محفوظ رہی۔

اسی قسم کی صدہا مثالیں ہیں جنھیں ایک معمولی سی بات کسی عظیم ترین واقعہ کا سبب بن گئی ہے پھر کیا ان واقعات کو بغیر بحث و تنقید کے ہم تقدیر کے سپرد کرسکتے ہیں اور کیا ہمیں ان کے اسباب پر غور نہ کرنا چاہئے۔ ایک دوست اسکندریہ کا رہنے والا ہے اور دوسرا قاہرہ کا دونوں نے مدت سے

ایک دوسرے کو نہیں دیکھا لیکن ایک روز وہ بالکل اتفاق سے کسی تیسری جگہ مل جاتے ہیں اور اس ملاقات کو حسن اتفاق پر محمول کرتے ہیں، لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حُسنِ اتفاق کوئی چیز نہیں ہے ان دونوں کا ملنا اسباب پر مبنی تھا جو اس طرح جمع ہو گئے کہ دونوں کا ایک مقام اور ایک وقت پر ملنا ممکن ہو گیا۔

چونکہ خود انسان کا وجود چند حوادث سے مرکب ہے اور ہر حادثہ کے لئے اسباب کا پایا جانا ضروری ہے اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر آنے والے موقعہ کے اسباب، زمانۂ ماضی میں پائے جاتے ہیں اور ہر واقعہ کے اسباب کا سلسلہ حدوثِ واقعہ سے لیکر ازل تک پہونچ سکتا ہے

جب ہم یہ ثابت کر چکے کہ تمام حوادث، تمام واقعات، تمام موجودات، تمام تغیرات و انقلابات نتیجہ ہیں اسباب کے، تو اب یہ دیکھنا چاہئے کہ اسباب کا یہ سلسلہ کسی غیر متبدل قانون کے تحت میں آتا ہے یا نہیں اگر ہم یہ کہیں کہ کسی قاعدہ کے تحت ہیں تو تقدیر کا اعتراف کرنا پڑے گا لیکن قانون فطرت جو تمام عالم کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کے تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

دُنیا میں ادنیٰ سے لیکر اعلیٰ تک کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جو محض اتفاق سے بلا تاثیر اسباب پیدا ہو گیا ہو بلکہ کائنات کا ہر ذرہ ایک زبردست اور باقاعدہ نظام کے تحت واقع ہے جو تمام موجودات پر حاوی ہے اور انسان کی سعادت و بدبختی کا ضامن ہے۔

قوموں کی حیات کا نشوونما، ناقابل تغیر اصول و قواعد کے تحت ہوا کرتا ہے اور ہر چند اس قوم کے ارباب سیاست کو اُن کا علم نہیں ہوتا، مگر وہ خود بخود اس کا اتباع کرتے ہیں۔ تمام افعال جو قصداً یا اضطراراً انسان سے سرزد ہوتے ہیں اور تمام متوقع و غیر متوقع حوادث جو دنیا میں رونما ہوتے ہیں سب ایک ہی زبردست نظام اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوتے ہیں جسے مذہب کی زبان میں تقدیر کہتے ہیں اور علم نجیم کی اصطلاح میں جاذبیت عامہ پھر چونکہ جاذبیت عامہ پر نظام شمسی منحصر ہے اور نظام شمسی کے تمام سیارے لامتناہی فضا میں ایک دوسرے پر اثرات ڈال کر حوادث کے اسباب پیدا کرتے رہتے ہیں، اس لئے اگر ہم کواکب کے اثرات سے واقف ہو جائیں تو آسانی سے مستقبل کا راز معلوم کر سکتے ہیں اور یہی ہے علم نجوم کا موضوع۔

(اعلیٰ قسم) (اعلیٰ قسم)

تصانیف نیاز فتحپوری

من و یزداں کامل ۔۔۔ مذہبی استفسارات و جوابات ۔۔۔ جمالستان ۔۔۔ نگارستان ۔۔۔ شہوانیات۔
مغہ ۸ر صہ ۸ر لاغہ ۴ر للغہ ۴ر
مکتوبات نیاز بنام حجاب ۔۔۔ انتقادیات ۔۔۔ حسن کی عیاریاں ۔۔۔ مالہ و ماعلیہ ۔۔۔ شہاب کی سرگزشت۔
عع ۱۲ر للغہ ۸ر ۶ر ۶ر ۶ر
فلاسفۂ قدیم ۔۔۔ مقالات نیاز ۔۔۔ فراست الید ۔۔۔ مذہب ۔۔۔ نقاب اٹھ جانے کے بعد ۔۔۔
عہ ۸ر بہ عہ ۸ر عہ ۸ر ۸ر

میزان
صہ ۸ر

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر مع محصول صرف چالیس ۴۰ روپے میں اخیر اپریل ۵۵ء تک۔ منیجر نگار

شیفتہ کی داستانِ عشق

ایک ذاتی کتب خانہ کے نوادر

غالب کے ہم عصر نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ شاعر بھی تھے اور ایک صاحبِ مذاق اور ثقہ نقاد بھی، ان کے زہد و اتقا کے متعلق اکثر مورخ متفق الرائے ہیں۔ لیکن عابد صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ اس متقی اور ثقہ شخص کی زندگی کچھ ایسی خشک نہیں تھی۔ حالی کے بعد انھوں نے ہماری ادبی تاریخ کی ایک دوسری ثقہ شخصیت کی زندگی کے ایک چھپے ہوئے پہلو سے پردہ اُٹھایا ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق جو نواب صاحب کو ایک نستعلیق طوائف نزاکت سے تعلق خاطر تھا۔ اور یہ کہ ان کے دل کے اندر اک آگ سی لگی ہوئی تھی اس کی گرمی ان کی شاعری میں بھی پہونچی ہے۔

میرے ہمسایہ میں ایک بزرگ قیام فرما ہیں ان کا اسم گرامی خلیل الرحمان فراددی ہے۔ ان کے پاس بزرگوں کے زمانہ سے چند نادر کتابیں چلی آرہی ہیں اور کچھ انھوں نے خود خریدی ہیں، بہرحال انھیں یہی شوق دامن گیر ہے کہ اچھی اور نادر کتابیں (مضامین کے اعتبار سے ہوں یا طباعت کے اعتبار سے) جمع کریں اور اب ان کے ذاتی کتب خانہ میں ادب، فقہ، حدیث اور دوسرے علوم و فنون کے متعلق اچھی خاصی کتابیں جمع ہوگئی ہیں۔ ان میں سے بعض تو ایسی ہیں کہ ان کا ایک ہی نسخہ اس وقت موجود ہے۔

آج کی صحبت میں ان کے کتب خانہ کے ذریعہ اور انکی نشاں دہی کے وسیلے سے نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ اور رنجو نزاکت کی داستان حیرت عنوان جو میں نے ریزہ ریزہ کرکے مرتب کی ہے پیش کرتا ہوں۔

نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کے زہد و اتقا کے متعلق اکثر مورخ ہم نوا ہیں اور سوائے کچھ تذکروں کے جن کے ذکر میں ابھی کرتا ہوں کسی نے ان کے اس مشہور معاشقے کا ذکر نہیں کیا جس کی بناء پر شیفتہ کے مخالف تذکرہ نویسوں نے ان کو طرح طرح سے بدنام کیا ہے۔

نستعلیق طوائفوں کا مرکز

شیفتہ اور رنجو نزاکت کی داستان پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دہلی دارالخلافہ ہونے کے باعث اور تمدن و شائستگی کا مرکز ہونے کی وجہ سے ہمیشہ ان ڈیرے دار نستعلیق طوائفوں اور کنچنیوں کا بھی مرکز رہی ہے جو فنون دلبری کے ساتھ ساتھ موسیقی میں بھی کمال رکھتی تھیں مشہور ہے کہ محی الدین اورنگ زیب کے زمانہ میں جب موسیقی اور متعلقہ فنون کی قدردانی کم ہونے لگی تو ڈوم ڈھاریوں نے موسیقی کا جنازہ نکالا تھا اور اورنگ زیب نے کہا تھا کہ ذرا گہرا گڑھا کھود کر دبانا کہ پھر برآمد نہ ہو جائے، بہرحال اس روایت سے یہ تو پتہ چلتا ہے کہ دہلی اُس وقت ڈیرے دار نستعلیق طوائفوں کا مرکز تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد جب محمد شاہ کا زمانہ آیا تو اس طائفے کی بہت قدردانی کی گئی۔ امراء و وزرا اور رعیت کے عام افراد تو گویا بادشاہ کے مذاق کے تابع ہوتے ہیں۔ انھوں نے ان کنچنیوں اور طوائفوں کے ہاں جانا کوئی عیب نہ سمجھا۔ یہاں تک کہ آزاد نے درد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ موسیقی میں خاص مہارت اور نظر رکھتے تھے اور بہت سی کنچنیاں بھی ان کی مرید تھیں۔

بہرحال میر درد کے زمانہ تک ڈیرے دار طوائف کا مکان ایک طرح اس تمام جنسی آسودگی خوش وضعی، بانکپن، حاضر جوابی اور طرحداری کا مرکز بن گیا تھا۔ جو دہلی کے شرفاء کو اپنے گھروں میں نصیب نہ ہوتی تھی۔ ظاہر ہے کہ گھر والی کتنی ہی مہذب اور خوش اخلاق کیوں نہ ہو وہ دلبری کی ان اداؤں سے تو

ناواقف ہوگی جو طوائف سے مخصوص ہیں - پھر رقص اور غنا کو ایک طلسمی اثر رکھتے ہیں - یہ بھی گھر میں نصیب نہ ہو سکتے تھے - یہی وجہ تھی کہ دہلی میں طوائفوں کے کے ہاں آنا جانا یا طوائفوں کا کسی رئیس یا نواب کے ہاں آنا جانا ایسا جرم نہ تھا کہ معاشرہ اسے معاف نہ کرے - اس زمانہ کے شعراء کے یہاں اکثر حوالے ایسے ملتے ہیں جو صرف طوائف سے متعلق ہو سکتے ہیں، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میر اور درد کے زمانہ میں کسی پردہ نشین خاتون سے عشق کرنا گویا سخت قسم کی رسوائی اور فضیحت کو دعوت دینا تھا - اور میں سمجھتا ہوں کہ شرفا کے ہاں یہ گویا رسم ہو گئی تھی کہ بھئی اگر عشق سے مفر نہیں ہے تو یہ کام ضرور ہی کرنا ہے تو اس کوچے میں جا کر کرو، جہاں دلبری کے فنون بکتے ہیں اور کسی باآبرو خاندان کی عزت پر خاک نہ ڈالو - اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ میر و درد کے زمانہ میں دہلی کے حسن و جمال کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ دراصل ان طوائفوں کا حسن و جمال ہے - ان اشعار پر غور فرمایئے گا:

میر سے	پھر موج ہوا پیچاں اے میر نظر آئی	شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی
	دل کے نہ تھے کوچے اوراق مصور تھے	جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی
مومن سے	تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں	اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
مصحفی سے	کرتی ہیں خون سیکڑوں تجھ کو بتاؤں کیا	پاؤں کی سرخیاں ترے ہونٹوں کی لالیاں
	اے مصحفی تو ان سے محبت نہ کیجیو	ظالم غضب کی ہوتی ہیں یہ دلی والیاں

شیفتہ اور نزاکت

شروع میں یہ عرض کر دیا گیا ہے کہ شیفتہ اور نزاکت کے متعلق آج کل کے تذکرہ نویس اور نقاد بالکل خاموش ہیں - البتہ ان کے معاصر یا ان کے بعد کے کچھ تذکرہ نویسوں نے نزاکت کی داستان کے کچھ ٹکڑے کسی نہ کسی رنگ میں ناظرین کو دکھائے ہیں - میں سمجھتا ہوں کہ شیفتہ نے گلشنِ بے خار میں نزاکت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کے تعلق خاطر اور شیفتگی کا ثبوت ملتا ہے - شیفتہ لکھتے ہیں کہ :-

" نزاکت "، مہ جلوہ ہے، مہر تمثال ہے - بدیع الجمال ہے، جاں نواز ہے - "شاہدے است شیریں و دلبرے است نمکیں" رخسار کی تاب سے آفتاب خجل ہوتا ہے اور جلوہ قامت دیکھ کر شمشاد پا بہ گل ہوتا ہے" ! تازہ گل گلشنِ جوانی نورس ثمر باغ زندگانی"

یہ تو صفات ظاہر ہیں مگر اس کا باطن بھی شیفتہ کے قول کے مطابق اسی طرح آراستہ ہے :-

" زیرکی شوخی، فطانت اور متانت سے بہرہ یاب اور دردمندی، بیدردی و فاپروری اور بے رحمی کے آئین سے بخوبی آگاہ ہے ! کبھی کبھی شعر کہتی ہے اور " طرز کلامش نیکوست " - یعنی اس کا اسلوب سخن گوئی خوب ہے "

نزاکت کی شاعری

شیفتہ کی زبان سے اتنی تعریف بہت ہے لیکن سخن گوئی کی تعریف سے زیادہ جو حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے اس کو ملحوظ خاطر رکھئے گا شعر جو نزاکت کے نقل کئے گئے ہیں وہ ایسے ہی ہیں - کوئی شعر ایسا نہیں جس کے متعلق کہا جا سکے کہ اعلیٰ درجے کا ہے - البتہ "سفر ایسی" "سحر ایسی" والی زمین میں تین شعر نزاکت نے اچھے نکالے ہیں ؎

نا منصفی اور اے بتِ بیداد گر ایسی	چاہت تیری غیروں کو بھی ہوگی مگر ایسی
حرماں ہے اگر چارۂ تقدیر تو ظالم،	تقصیر نہ ہوگی کبھی بار دگر ایسی
ہم بزمِ دشمن کو چھپانا ہی تھا قاصد	کہتا ہے کسی سے کوئی ناداں خبر ایسی

دوسرے تذکرہ نگاروں کی شہادت

یوں تو تذکرۂ گلشنِ بے خار کی شہادت ہے، اب دوسرے تذکرہ نویسوں کی شہادت پر غور فرمایئے، گلدستۂ نازنیناں کے مؤلف (مطبوعہ ۱۸۴۵ء) لکھتے ہیں :

" نزاکت تخلص، دل آرام رنجو نام - بچپن سے جلوہ آرائے شاہ جہاں آباد ہے"

معلوم ہوا ہے کہ نزاکت ۱۸۴۵ء تک زندہ تھی اس وقت تک نواب صاحب بھی زندہ تھے - اس لئے گلدستۂ نازنیناں کے مؤلف نے کھل کر بات نہیں کی بہارستان ناز کے مؤلف رفیع الدین رنج شاگرد غالب نے بھی شیفتہ اور نزاکت کے تعلقات کو پردۂ اخفا میں رکھا لیکن اشعار وہی نقل کئے ہیں - اشعار میں تو کوئی اضافہ نہیں کرتا ——— صرف گلشنِ بے خار والے اشعار کو نقل کرتا ہے (بہارستانِ ناز کا پہلا اڈیشن ۱۸۶۴ء میں میرٹھ میں

شایع ہوا۔ اس کی طبع ثالث خلیل الرحمان صاحب کے کتب خانہ میں ہے)

سید غلام قطب الدین باطن گلستان بے خزاں میں لکھتے ہیں کہ "ان نیک بخت کا رتبہ ان کے (یعنی شیفتہ کے) جوشِ محبت نے استادوں سے بھی بڑھا دیا۔ اور یہ ایک طرح سچ بھی ہے کہ نظیر اکبر آبادی تو مردود ٹھہریں اور نزاکت، اسلوب شعر گوئی میں ممدوح کہیں یہ کہنا بھول گیا کہ صاحب بہارستان ناز ۱۸۸۳ء والی اشاعت میں یہ لکھتے ہیں کہ نزاکت اللہ کو پیاری ہو چکی ہے اور اب حضرت سلطان جی صاحب میں اس کی قبر کا ایک نشان ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ فقرے ۱۸۶۴ء میں لکھے گئے تھے یا ۱۸۷۴ء اور ۱۸۸۳ء میں کسی وقت نزاکت نے انتقال کیا اور مؤلف بہارستان ناز نے مناسب ترمیم کی۔

تذکرۃ النسا کی شہادت

ہاں تو صاحب گلستان بے خزاں کے بیان سے یہ بات جھلکتی تھی کہ شیفتہ اور نزاکت کے درمیان معاشقہ ہوا تھا لیکن وضاحت ان کے بیان میں بھی نہ تھی البتہ درگا پرشاد نادر نے تذکرۃ النسا (مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۸۸۴ء) میں یہ بات بالکل صاف کر دی اور لکھا کہ نزاکت تخلص، رمجو نام۔ نارنول کی بت بازاری ستم شعاری ہے جو شیفتہ مرحوم صاحبِ گلشنِ بے خار کی دوست داری سے شاعری میں نام پا گئی۔ منگلو نامی اس کی دوسری بہن میر احمد علی مختار کار عدالت فوجداری کے گھر میں پڑ گئی تھی۔

گلشنِ بے خار میں خود شیفتہ نے جو کچھ لکھا ہے اس کو تذکرہ نویسوں کے ان بیانات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو واقعہ کی اصل صورت ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ مان کر بھی کہ گلستانِ بے خزاں کا مؤلف شیفتہ کی مخالفت پر تلا ہوا ہے، رہی سہی جو کسر تھی وہ کلب علی خاں صاحب فائق رامپوری نے پوری کر دی ہے اور انھوں نے شیفتہ کا غیر مطبوعہ کلام شایع کر کے (معارف ستمبر ۱۹۵۴ء) اس قصے کی حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے۔ اس کلام میں وہ مثنوی بھی ہے جو رمجو اور منگلو طوائفوں کی مسی مالی کے موقعہ پر شیفتہ نے لکھی ہے اور خود ہی سال تاریخ بھی نکالا ہے: "کہا اس نے دوغنچۂ سوسن"

۱۲۴۴ھ

شیفتہ کی ولادت ۱۲۱۸ھ کی ہے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ معاشقہ بیس اکیس برس کی عمر میں شروع ہوا۔ گلشنِ بے خار (شیفتہ کا تذکرہ) میری معلومات کے مطابق کوئی ۱۲۵۰ھ کے لگ بھگ لکھا جاتا ہے، اس وقت یہ معاشقہ چل رہا ہے اور نزاکت کی کمسنی کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دنوں ان کی عمر ۲۰، ۲۱ سال سے زیادہ نہ ہوگی اور "مسی مالی" کی تقریب جس پر شیفتہ نے مثنوی کہی ہے نزاکت کے ۱۴ یا ۱۵ برس کے ہونے پر واقع ہوئی ہوگی۔ (یہ میرے قیاسات ہیں)

ترکِ تعلق

۱۸۳۹ء میں نواب صاحب حج کرنے روانہ ہوئے (۱۲۵۴ھ) اور قریباً ۲ سال کے بعد ۱۸۴۱ء (۱۲۵۶ھ) واپس دہلی تشریف لائے قیاس کیا جاتا ہے کہ حج کرنے کے بعد جہاں نواب صاحب نے اور منہیات سے توبہ کی ہے۔ نزاکت سے بھی قطع تعلق کر لیا ہو۔ اس داستان کی تیز روشنی میں دیوان شیفتہ کا مطالعہ تو از سر نو کرنا پڑے گا ہی میں آج کی صحبت میں آپ کو صرف کچھ غیر مطبوعہ اشعار سناتا ہوں۔

نزاکت شیفتہ کے شعروں میں

ایک مثنوی ہے۔ مقام یہ ہے کہ رمجو نزاکت دہلی سے کہیں گئی ہے۔ شیفتہ بیقرار ہو کر کہتے ہیں ؎

عاشق سے رم جو کر گئے تم — اپنے ہی نام پر گئے تم
اب تازہ رقیب شاد ہوں گے — ہم کا ہے کو تم کو یاد ہوں گے
آتا ہوں میں بار بار در تک — بے تابی ہے شام سے سحر تک
بے ہوشی اور بے حواسی — دشوار ہے خویشتن شناسی

اب کچھ غیر مطبوعہ غزلوں کے اشعار سن لیجئے:

اگر کیجئے اس پری کی بیاں داستان رقص — ہو وجد اہلِ حال کو شکر بیانِ رقص
تھا دا کو رقص طائرِ بسمل کی طرح شب — سن کر عدو کے گھر میں تری داستانِ رقص
اپنی تیغِ نگہ کی آب کو دیکھ — دلِ بے حوصلہ کی تاب کو دیکھ
مجھ سے بے خوابی کا سبب مت پوچھ — اپنی ہی چشمِ نیم خواب کو دیکھ
غیر کے آنے کی رنجش نہیں جاتی اس سے — مجھ پہ طوفاں ہے لو یاں کوئی نہ آیا ہوگا
اُف رے آدابِ محبت کہ ترے کوچے میں — جب تلک سر نہ رکھا پاؤں اُٹھایا نہ گیا

(قومی آواز)

عابد علی عابد

مشاعرۂ نگار

دسمبر ۵۴ء کے "نگار" میں ایک شعر پیش کیا گیا تھا:

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اور اہلِ ذوق سے درخواست کی گئی تھی کہ اس زمین میں فکر کریں۔

اس درخواست کے جواب میں کئی سو غزلیں پہونچیں، لیکن ان میں سے اکثر ایسی تھیں کہ ایک شعر بھی انتخاب میں نہ آسکا، باقی غزلوں میں بھی قابلِ توجہ اشعار بہت کم نظر آئے، حتےٰ کہ جو انتخاب میں آسکے انھیں بھی صرف "غنیمت" کہا جاسکتا ہے۔ اور جو شعر پیش کیا گیا تھا اس کے سامنے سب بے نور نظر آتے ہیں۔ تاہم، میں تمام ان حضرات کا شکر گزار ہوں جنھوں نے اس دعوت کو قبول فرماکر اپنی غزلیں روانہ فرمائیں۔

نیاز

اثر لکھنوی :-

دُعا سحر کی جو مانگی تو یوں قبول ہوئی،
شبِ فراق ستاروں میں روشنی نہ رہی

اب اس کے بعد گلہ کس سے کیجئے کس کا
کہ جلوہ پیشِ نظر، تابِ دید کی نہ رہی

تری خوشی تو ہوئی عشق آرزو دشمن
بلا سے لذتِ آہِ سحر گہی نہ رہی

جس اشک تر میں اثرؔ تھی شراب کی مستی
وہی ہے اشک گہر اب وہ سرخوشی نہ رہی

احسان دربھنگوی :-

سوا ہمارے کسی پر بھی یہ کرم نہ ہوا
سوا ہمارے کسی سے یہ بے رُخی نہ رہی

جو اس زمین کا ذرہ کوئی چمک اُٹھا
تو پھر فلک کے ستاروں میں روشنی نہ رہی

ادیب سہارنپوری :-

کہاں سے انجم و مہتاب لیکے آئیں گے
ترے لبوں پہ کسی دن اگر ہنسی نہ رہی

حضورِ دوست ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ ہم
جو بات کہنے گئے تھے، وہ یاد ہی نہ رہی

قدم قدم پہ ہمیں رہبروں نے یوں لوٹا
کہ یاد راہزنوں کی بھی رہزنی نہ رہی

سید ارتضیٰ عزمی (کراچی)

یہ ہوش تھی تو نہیں انتظار میں تیرے
کہ پھول کھل گئے تاروں میں روشنی نہ رہی

نظر نظر سے ملا اور مسکرائے جا،
کہ پھر یہ بزمِ تماشا رہی رہی نہ رہی

ارشد صدیقی ساگری :-

شبِ فراق یہ عالم بھی دل پہ گزرا ہے
کہ آنکھ اُٹھائی تو تاروں میں روشنی نہ رہی

جنونِ عشق کے آداب، اے معاذاللہ! خودی کا نام لیا تھا کہ بے خودی نہ رہی

افسر (امروہوی)

ہزار ضبط کیا پھر بھی آ گئے آنسو، یہ دل کی آگ ہی ایسی تھی جو دبی نہ رہی

اکبر حیدرآبادی :-

گزر چکی ہے تسلی کی منزلوں سے حیات اب اپنے درد میں شاید کوئی کمی نہ رہی
مسرتوں کا تصور تھا پھر بھی کیف آور خوشی نصیب ہوئی جب خوشی خوشی نہ رہی

اکرم دھولیوی :-

اک انتظار مسلسل اک اضطراب مدام ترے خیال میں آسودگی کبھی نہ رہی
کسی کے غم کا اثر دل پہ ہے وہی اکرم یہ اور بات ہے آنکھوں میں اب نمی نہ رہی

باسط :-

ہر ایک ذرہ سے پیغام تیرا پاتا ہوں اگرچہ دہر میں رسمِ پیمبری نہ رہی

بزمی گنوری :-

فغاں نے کر ہی دیا سوزِ عشق کو بدنام یہ آگ لاکھ دبائی مگر دبی نہ رہی

جرم محمدآبادی :-

چمن میں بھی کوئی حد انقلاب کی نہ رہی جھپک کے آنکھ کھلی تو کلی، کلی نہ رہی

حباب ترمذی :-

نگاہِ یاس کا عالم ارے معاذاللہ کہ شام ہی سے ستاروں میں روشنی نہ رہی

حبیب آروی :-

اک انتظار میں گزری ہے رات ایسی بھی نظر اٹھی تو ستاروں میں روشنی نہ رہی

حسام الدین حسام :-

خلش عبث ہے جب ان سے امید ہی نہ رہی دلِ حزیں میں کوئی آرزو رہی نہ رہی
وطن سے بعد - عزیزوں سے دور - حالِ تباہ وہ شمع بزم ہوں میں جس میں روشنی نہ رہی

حیرت کوکنی :-

ہوا نہ میں کبھی ممنونِ ساغر و مینا، نظر، نظر سے ملی اور تشنگی نہ رہی

دل شاہجہاں پوری :-

تری طلب کے سوا آرزو کوئی نہ رہی بڑھے کچھ اور تو اپنی بھی آگہی نہ رہی
خموش اِدھر ہوئی اک منتظر کی شمعِ حیات اُدھر سحر کے ستارے میں روشنی نہ رہی
رہا شعور نظر بے خودی کے عالم تک حدودِ ہوش میں پہونچے تو آگہی نہ رہی
پھر ایک گردشِ ساغر بیادگار شباب کچھ اعتبار نہیں زندگی رہی نہ رہی
وہیں پہ ختم ہوئی داستانِ عشق وفا جہاں سے مشق ستم میں کوئی کمی نہ رہی
غرقِ بحر ہی رہنا کمالِ عرفاں تھا اُبھر کے پھر ہمیں ساحل سے آگہی نہ رہی

وہ مسکراتے ہوئے اس ادا سے گزرے ہیں — چمن میں غیر شگفتہ کوئی کلی نہ رہی

رازؔ چاندپوری :-

حریف تیز قدم کو دعائیں دیتا ہوں، — رہِ طلب میں مجھے فکر گمرہی نہ رہی

رضاؔ شاہجہاں پوری :-

ملال یہ ہے کہ غم بھی بقدر ظرف نہیں — ملال یہ نہیں مجھ کو کوئی خوشی نہ رہی

رضاؔ مظہری :-

صنم کدے بھی ہیں ویراں حرم کو کیا کہیئے — نیاز و ناز کی دنیا میں دل کشی نہ رہی
قرار کو تو بلایا تھا نا امیدی نے — تم آگئے تو ضرورت قرار کی نہ رہی

روشنؔ نگینوی :-

وہ گل کھلے ہیں چمن میں بہار آنے پر — سکوں تو خیر! سکوں کی امید بھی نہ رہی
مقام شکر ہے شکوہ کی جا نہیں روشنؔ — ملا وہ غم کہ تمنائے سرخوشی نہ رہی!

ساحرؔ بھوپالی :-

الم الم نہ رہا اور خوشی خوشی نہ رہی — مزہ تھا جس سے خلش کا وہ بات ہی نہ رہی
شبِ فراق کا کتنا اُداس ہے منظر — کہ جیسے چاند ستاروں میں روشنی نہ رہی
بجھی جو شمعِ تمنا تو یوں نظر آیا — کہ جیسے سارے زمانے میں روشنی نہ رہی

سالکؔ انصاری :-

آلِ سوختگانِ وفا معاذ اللہ — سحر کے وقت پتنگوں کی خاک بھی نہ رہی

سعیدؔ اکبرآبادی :-

انھیں کے دم سے تھی رنگینی خیال و نظر — وہ کیا گئے کہ کسی شے میں دل کشی نہ رہی

سُہاؔ شیوی :-

بس ایک بار ہی ان سے مری نگاہ ملی، — پھر اس کے بعد تمنائے زندگی نہ رہی

سیفیؔ گنوری - ام - اے :

یہ اور بات ہے، دل کو قرار مل نہ سکا، — ترے خلوص و محبت میں کچھ کمی نہ رہی

شارقؔ :-

کسی کے درد محبت کے بخشنے کی تھی دیر — پھر اس کے بعد کسی چیز کی کمی نہ رہی
ترے بغیر بھی ہنسنے کو میں ہنسا ہوں مگر — ہنسی کی طرح لبوں پر کبھی ہنسی نہ رہی

شاکرؔ آصفی :-

نقاب چہرے سے جھنجھلا کے اس نے یوں الٹی — کہ جیسے مجھ میں نظارے کی تاب ہی نہ رہی
عدو سے وعدہ کیا اس نے اور وفا نہ کیا، — اگرچہ بات بُری تھی مگر بُری نہ رہی
خبر ہو تیری محبت کی کیا اسے شاکرؔ — جسے خود آج تک اپنی خبر کبھی نہ رہی

شاکرؔ کلکتوی :- وفا شعار شکایت جفا کی کیا کرتے، — جفا جو آپ نے کی ان کو یاد ہی نہ رہی

شرف گنوری :-

اب آپ آئے ہیں بیمار کی عیادت کو — جب اُس میں آنکھ اُٹھانے کی تاب بھی نہ رہی

شفا گوالیاری :-

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے — چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی

شفقت کاظمی :-

جفائے یار باندازِ دل بری نہ رہی، — مرے نصیب میں شاید کوئی خوشی نہ رہی
عجیب چیز تھی کوئے بتاں کی دربانی، — کہ جس کو پا کے ہوائے سکندری نہ رہی
نصیب اہلِ تمنا سنور گیا شاید، — کہ زُلفِ یار میں پہلی سی برہمی نہ رہی
ہماری موت محبت کی موت تھی شفقت — ہمارے بعد رہ و رسمِ عاشقی نہ رہی

شمس شاہجہاں پوری :-

یہ اور بات ہے مجھکو سکون ہو نہ سکا — نوازشوں میں اُدھر سے کوئی کمی نہ رہی
تمہارے جلوۂ دل کش کی تاب لا نہ سکے — نقاب اُٹھی تو ستاروں میں روشنی نہ رہی

شہزور کاشمیری :-

ترے جمال کی تنویر اے معاذ اللہ — مرے خیال کی دنیا میں رات ہی نہ رہی

شیدا (ایوب خاں)

ستم تو دیکھئے کرتے ہیں کب وہ پرسشِ حال — کہ تاب ہی مجھے جب عرضِ حال کی نہ رہی

عابد شاہجہاں پوری :-

زباں تک آہی گئے اضطراب کے شکوے — حیاتِ عشق میں اب کوئی دل کشی نہ رہی

فایز آصفی :-

غریب خانے کی تاریکیوں کا کیا کہنا، — جلے چراغ تو سمجھو کہ مفلسی نہ رہی

فخر ایم - اے :-

تیرے خیال نے بخشی ہیں رونقیں ورنہ — فضائے زیست پہ کب غم کی تیرگی نہ رہی ؟
فرازِ طور پہ بھی دوست کی خبر نہ ملی — اگر ملی تو خود اپنی ہی آگہی نہ رہی
فنا ئے داغِ محبت ہی فخر کام آئی — شبِ فراق جو تاروں میں روشنی نہ رہی

کاوش :-

بجھی نہیں ہے فقط شمعِ آرزو کاوش — فلک پہ بھی مہ و انجم میں روشنی نہ رہی

کوکب شاہجہاں پوری :-

حزیں حیات، اُداس آرزو، ملول احساس — کسی چراغ میں اگلی سی روشنی نہ رہی
بُجھا بجھا سا ہے دل اب کہاں وہ شعلۂ شوق — وہ جاں فروز جہاں تاب روشنی نہ رہی
خیال دوست رہا دل میں اس طرح کوکب — کہ بے کسی بھی حقیقت میں بے کسی نہ رہی

ضیاء ملتانی :- ضیاؔ! اب ان کا کرم بھی ستم ہو میرے لئے — جفائے دوست میں آخر کوئی کمی نہ رہی

غیرت مورانوی :-

رہِ وفا میں کچھ ایسے بھی دن گزارے ہیں
کہ جیسے مہر درخشاں میں روشنی نہ رہی

فرحت صدیقی (ملتانی)

حدودِ عشق میں ایسا بھی اک مقام آیا
شریکِ حال جہاں تیری یاد بھی نہ رہی

حیات دردِ مسلسل کا نام ہے فرحتؔ
ملا سکون تو سمجھو کہ زندگی نہ رہی

فضا جالندھری :

سبق دئے وہ رفیقانِ راہ نے مجھ کو
کہ اب سفر میں تمنائے ہمسفر ہی نہ رہی

قاصد برانوی :-

ابھی اُٹھا ہی رہے تھے نقاب وہ رخ سے
یہ کیا ہوا کہ ستاروں میں روشنی نہ رہی

کامل کراروی :-

وفا پہ مٹنے کا حاصل یہ کم نہیں شاید
جسے تھا موت کا خطرہ وہ زندگی نہ رہی

مانوس سہسرامی :-

زمانہ سازِ نگاہوں کو کیا کہے کوئی،
یہی کہ اب ہوسِ سعیِ خام بھی نہ رہی

مانی (سید کلبِ احمد) جائسی :-

وہ التفات کا دھوکھا وہ برہمی نہ رہی
جھلک سی آس کی تھی، اب وہ بات بھی نہ رہی

بہارِ عیش کی رنگینیاں ہوں جس پہ نثار
وہ ابتدائے تمنا کی سادگی نہ رہی

وہ جلوہ گر ہیں مگر وائے شومیِ تقدیر
حواس گم ہیں نگاہوں میں روشنی نہ رہی

خوشی تو ہے کہ بہت مہرباں ہیں وہ مجھ پر
مگر یہ مصلحتِ لطف اگر کبھی نہ رہی

صلائے عام ہے، اہلِ ہوس بھی آجائیں
اب امتحان میں وہ شرطِ جاں دہی نہ رہی

محشر آصفی :-

حریمِ ناز سے نکلا جو بے نقاب کوئی
تو دیکھنے کو اٹھی تھی جو آنکھ اُٹھی نہ رہی

ناظر الحسینی :-

جلیں گے راہِ مشقت میں اب دلوں کے چراغ
ملال کیا جو ستاروں میں روشنی نہ رہی

ندیم جعفری :-

یہی بہت ہے ترے شوقِ کامراں کے طفیل
وہ ہم میں کاہشِ حرمانِ بیدلی نہ رہی

ندیم کرتے رہے اُن سے التجائے کرم
اگرچہ تابِ سخنہائے گفتنی نہ رہی

نصرت کرلوی :-

ابھی کھلی ابھی مرجھا کے رہ گئی نصرت
کلی امید کی کچھ دیر بھی کھلی نہ رہی

نظامی کوئٹہ :-

بہارِ گل بھی چمن میں تھی بے بقا کتنی،
کیا جو عزمِ تماشا بہار ہی نہ رہی

تمہارے حُسن کو دیکھا نگاہ گم کر کے — پھر اس کے بعد کوئی چیز دیدنی نہ رہی
تمہارے ہوتے ہر اک شے تھی مرکزِ نور — جو تم گئے تو کسی جا بھی روشنی نہ رہی
نظامی اپنی تو بس یہ ہے داستانِ حیات — کہ زندگی میں تمنائے زندگی نہ رہی

نظمی :-

کسی کے روئے منوّر کو دیکھنے کے لئے — اُٹھی نگاہ مگر دیر تک اُٹھی نہ رہی

وحشت کلکتوی :-

جو زندگی میں ہمیں کچھ امید ہی نہ رہی — تو زندگی ہی ہماری رہی رہی نہ رہی
مقام شکر ہے اک ایسا وقت آپہونچا — کہ دل کے حال کی خود دل کو آگہی نہ رہی
غلط ہے دوں جو گلستانِ دہر کو الزام — جب اپنے غنچۂ خاطر میں تازگی نہ رہی
یہ کس کی جلوہ نمائی ہے بزم میں وحشت — بقول میر چراغوں میں روشنی نہ رہی

ہاشم مونگیری :-

شبِ فراق یہ عالم بھی میں نے دیکھا ہے — کبھی کبھی تو ستاروں میں روشنی نہ رہی

مشاعرۂ نگار کی دوسری طرح

افسوس ہے کہ اس سے قبل جو "مصرعۂ طرح" دیا گیا تھا وہ مشکل ثابت ہوا اور اچھے اشعار اس میں بہت کم نکل سکے۔ آئندہ ایک غیر مردّف زمین تجویز کی گئی ہے جس میں اظہار خیالات و جذبات کے لئے زیادہ وسعت ہے۔ مصرعۂ طرح یہ ہے :-

مری آنکھوں سے ہے اِک آبشارِ آرزو جاری

(جاری - ساری - سرشاری وغیرہ قافیہ)

اس زمین میں جو غزلیں موصول ہوں گی وہ مئی کے نگار میں شایع کی جائیں گی اس لئے زیادہ سے زیادہ

۱۵ر اپریل ۵۵ء تک

غزلیں یہاں پہونچ جانا چاہئے۔ — شکریہ

۱۸ر فروری ۵۵ء - **نیاز فتحپوری**

دُنیا کی خاص خاص حکومتیں

نام سلطنت	دارالحکومت	آبادی	رقبہ مربع میل	حکومت کی نوعیت
۴- آسٹریلیا	کن برا	۸۲۴۱۵۹۳	۲۹۷۴۵۸۱	پارلمانی (ممبر کامن ویلتھ)
آسٹریا	ویانا	۷۰۹۰۱۲۲	۳۲۳۷۵	جمہوریت
آئرلینڈ	ڈبلن	۳۰۰۶۰۰۰	۲۷۱۳۷	جمہوریت
۴- آئس لینڈ	ریک جاوِک	۱۴۰۹۶۸	۳۹۶۹۸	جمہوریت
اٹلی	روم	۴۶۲۷۲۰۰۰	۱۱۶۲۲۴	جمہوریت
انڈو چائنا	ہنوئی	۲۷۴۶۰۰۰۰	۲۷۲۳۵۵	فرنچ یونین
۴- انڈونیشیا	جکرتا	۷۹۲۶۰۰۰۰	۵۷۵۸۹۳	جمہوریت
اسپین	میڈرڈ	۲۸۵۱۴۸۷۴	۱۹۲۳۲۲	ملوکیت
اسرائیل	یروشلم	۱۲۵۰۰۰۰	۷۹۵۱	جمہوریت
انگلستان	لندن	۴۰۳۸۶۸۰۰	۵۰۸۷۴	پارلیمانی
افریقہ	—	۱۹۸۰۰۰۰۰۰	۱۱۶۰۰۰۰۰	—
۴- افغانستان	کابل	۱۲۰۰۰۰۰۰	۲۴۵۰۰۰	ملوکیت
الجزایر (الجیریا)	الجیریا	۸۷۲۴۰۰۰	۸۵۱۳۱۲	زیر اقتدار فرانس
۴- ایران	طہران	۱۸۳۸۷۰۰۰	۶۲۹۳۴۳	ملوکیت
ایشیا	—	۱۳۱۴۰۰۰۰۰۰	۱۶۷۹۳۰۰۰	—
۴- برما	رنگون	۱۸۳۰۴۰۰۰	۲۶۱۶۱۰	جمہوریت
۴- بلجیم	بروسلز	۸۶۲۵۰۸۴	۱۱۷۷۹	ملوکیت
بلغاریہ	صوفیہ	۷۱۶۰۰۰۰	۴۲۷۹۶	جمہوریت
۴- پاکستان	کراچی	۷۴۴۳۶۹۴۲	۳۷۷۰۷۳	خود مختار (ممبر کامن ویلتھ)
پرتگال	لسبن	۸۶۱۸۰۰۰	۳۵۴۱۴	جمہوریت
۴- پولینڈ	وارسا	۲۴۴۴۸۰۰۰	۱۲۱۳۵۹	جمہوریت
۴- ترکی	انقرہ	۲۰۹۳۴۶۷۰	۲۹۶۱۸۵	جمہوریت
جاپان (۱۹۳۷ء)	ٹوکیو	۱۰۵۲۲۶۱۰۰	۲۶۳۳۵۷	ملوکیت
جاپان (موجودہ)	ٹوکیو	۱۴۲۹۷۹۸	۴۷۰۷	ملوکیت
جارجیا	اٹلانٹا	۳۴۴۴۵۷۸	۵۸۸۷۶	امریکی صوبہ
جبرالٹر (جبل الطارق)	جبرالٹر	۲۴۰۰۰	۲	برطانوی مستعمرہ

جرمنی (۱۹۳۷ء)	برلن	۶۶۶۱۶۰۰۰	۱۸۱۶۸۳	جمہوریت
(موجودہ) جرمنی (مشرقی حصہ)	برلن	۱۷۳۱۳۷۳۴	۴۱۳۸۰	جمہوریت
جرمنی (مغربی حصہ)	بون	۴۷۵۷۵۶۵۸	۹۴۷۰۷	جمہوریت
م - چین	پیکنگ	۴۶۳۴۹۳۰۰۰	۳۸۵۰۰۰۰	جمہوریت
م - حبش	عدیس ابابا	۱۰۰۰۰۰۰۰	۴۰۹۲۶۴	ملوکیت
روس (۱۹۳۸ء)	ماسکو	۱۷۰۰۰۰۰۰۰	۸۱۷۳۰۰۰	سوویٹ جمہوریت
م - روس (موجودہ)	ماسکو	۱۱۰۰۰۰۰۰۰	۲۲۰۹۰۰۰	سوویٹ
رومانیا	بخارسٹ	۱۶۰۰۷۰۰۰	۹۱۷۰۰	جمہوریت
م - زیکوسلووکیا	پراگوے	۱۲۴۲۳۰۰۰	۴۹۳۵۴	جمہوریت
سنگاپور	سنگاپور	۱۱۱۴۴۸۳	۲۸۲	برطانوی مستعمرہ
م - سعودی عرب	ریاض اور مکہ	۵۵۰۰۰۰۰	۴۱۳۷۹۲	ملوکیت
سوئٹزرلینڈ	برن	۴۷۰۰۲۹۷	۶۶۰۶۳	جمہوریت
سوڈان (انگریزی مصری)	خرطوم	۸۳۰۹۶۶۳	۹۶۷۵۰۰	مصری و برطانوی مشترکہ اقتدار
سوڈان (فرانسیسی)	باکو	۳۱۷۶۷۰۰	۴۶۱۳۹۰	فرانسیسی کالونی
م - سویڈن	اسٹاکہام	۷۰۱۷۰۰۰	۱۷۳۴۲۳	ملوکیت
سیلون	کولمبو	۷۵۳۹۰۰۰	۲۵۳۳۲	پارلمانی (ممبر کامن ویلتھ)
م - شام	دمشق	۳۵۱۳۰۲۴	۶۶۰۶۳	جمہوریت
عدن	عدن	۷۳۰۸۷۶	۱۱۵۰۸۰	برطانوی کالونی
م - عراق	بغداد	۴۷۹۹۰۰۰	۱۶۸۲۴۳	ملوکیت
عربستان	—	۱۰۰۰۰۰۰۰	۱۰۰۰۰۰۰	—
فارموسا	تائی پئی	۶۳۸۴۰۱۹	۱۳۸۸۵	زیر اقتدار چانگ کائی شیک
م - فرانس	پیرس	۴۱۵۵۰۰۰۰	۲۱۳۰۰۹	جمہوریت
فرانسیسی مغربی افریقہ	ڈکر	۱۶۵۳۵۳۰۰	۱۸۰۵۲۸۳	فرانسیسی مقبوضہ
م - فلپین	منیلا	۱۹۵۱۸۰۰۰	۱۱۵۶۰۰	جمہوریت
فن لینڈ	ہلسنکی	۴۰۰۷۰۸۲	۱۳۰۱۱۹	جمہوریت
کناڈا	اٹاوا	۱۳۸۴۵۰۰۰	۳۸۴۵۱۴۴	پارلمانی (ممبر کامن ویلتھ)
کوریا (شمالی و جنوبی)	سیول	۲۹۲۹۱۰۰۰	۸۵۲۲۲	جمہوریت
کویت	کویت	۱۷۰۰۰۰	۸۰۰۰	شخصی حکومت
گرین لینڈ	گاڈتھاب	۲۳۰۰۰	۸۳۹۹۹۹	مستعمرہ ڈنمارک
م - لبنان	بیروت	۱۲۳۸۰۰۰	۳۹۲۷	جمہوریت
لیبیا	طرابلس	۱۱۷۴۰۰۰	۶۷۹۳۴۳	زیر انتظام اقوام متحدہ

مراکش (فرانسیسی)	رباط	۸۶۱۷۳۸۷	۱۶۱۳۶۹	مقبوضۂ فرانس
مراکش (اسپین)	تیتیوان	۱۱۶۰۰۰۰	۷۵۸۹	مقبوضہ اسپین
م- مصر	قاہرہ	۲۰۰۴۵۰۰۰	۳۸۶۰۰۰	عسکری ڈکٹیٹرشپ
م- میکسیکو	میکسیکو	۲۵۵۸۱۲۵۰	۷۶۰۳۷۳	جمہوریت
ملایا	کوالالمپور	۵۰۸۲۰۰۰	۵۰۵۹۸	زیرحفاظت برطانیہ
م- ناروے	اوسلو	۳۲۶۵۰۰۰	۱۲۵۱۸۲	ملوکیت
نیپال	کاٹھمنڈو	۶۹۱۰۰۰۰	۵۴۰۰۰	شخصی حکومت
م- نیوزیلینڈ	ولنگٹن	۱۹۲۰۰۰۰	۱۰۳۴۱۶	خودمختار (ممبر کامن ویلتھ)
ہندوستان	نئی دہلی	۳۵۶۸۹۱۶۲۴	۱۲۲۱۸۸۰	جمہوریت
ہنگری	بوڈاپسٹ	۹۲۲۴۰۰۰	۳۵۹۱۲	جمہوریت
م- یمن	صنعاء	۵۰۰۰۰۰۰	۷۵۰۰۰	ملوکیت
یوروپ	—	۵۳۳۰۰۰۰۰۰	۳۷۶۲۰۰۰	—
م- یوگوسلیویا	بلگراڈ	۱۶۲۵۰۰۰۰	۹۹۱۸۱	جمہوریت
م- یونان	ایتھنس	۷۹۶۰۰۰۰	۵۱۱۸۲	ملوکیت

م = ممبر مجلس اقوام متحدہ

برہائے اعظم

نام	رقبہ مربع میل	کل آبادی	آبادی فی مربع میل	اوسط بلندی سطح آب سے
افریقہ	۱۱۶۰۰۰۰۰	۲۰۰۰۰۰۰۰۰	۱۷ء۱	۱۹۰۰ فٹ
انٹارکٹک	۵۱۰۰۰۰۰	غیر آباد	×	۶۰۰۰ فٹ
ایشیا	۱۶۷۹۳۰۰۰	۱۳۱۴۰۰۰۰۰۰۰	۷۸ء۲	۳۰۰۰ فٹ
آسٹریلیا	۲۹۷۴۵۸۱	۸۲۴۱۵۹۳	۲ء۸	۱۰۰۰ فٹ
یوروپ	۳۷۶۲۰۰۰	۵۳۳۰۰۰۰۰۰۰	۱۴۱ء۷	۹۸۰ فٹ
شمالی امریکہ	۹۳۷۵۰۰۰	۲۱۳۰۰۰۰۰۰	۲۲ء۷	۲۰۰۰ فٹ
جنوبی امریکہ	۶۸۴۶۰۰۰	۱۰۸۰۰۰۰۰۰	۱۵ء۸	۱۸۱۰ فٹ

کچھ زمین کے بارہ میں

زمین کی دو حرکتیں ہیں، ایک اُس کی محوری گردش جیسے لٹو اپنی کیل پر گردش کرتا ہے اور دوسری گردش آفتاب کے چاروں طرف طواف کرنے کی۔ محوری گردش وہ ایک ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے ۲۴ گھنٹوں میں طے کرلیتی ہے جس سے رات دن کا ظہور ہوتا ہے دوسری گردش آفتاب کے گرد وہ ۶۶۷۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۳۶۵ دن، پانچ گھنٹے ۴۸ منٹ ۴۶ سکنڈ میں پوری کرتی ہے جس سے مختلف موسم ظہور میں آتے ہیں۔

زمین کی عمر کا اندازہ کم از کم دو ارب سال کیا جاتا ہے۔

شرقاً غرباً خطِ استوا پر اس کا قطر ۷۹۲۶۶۸ میل ہے۔

قطبین کے درمیان شمال سے جنوب تک اس کا قطر ۷۸۹۹۹۸ میل ہے۔

خطِ استوا پر اس کا محیط یا دائرہ ۲۴۹۰۲ میل ہے اور قطبین کے درمیان شمالاً جنوباً ۲۴۸۶۰ میل۔

زمین کے وزن کا اندازہ ..... ۶۶۰۰ ٹن کیا جاتا ہے۔

زمین کا کُل رقبہ ۱۹۶۹۴۰۴۰۰ مربع میل ہے۔

زمین کا رقبہ خشکی ۵۵۸۸۵۰۰۰ مربع میل ہے۔

زمین کے سمندروں کا رقبہ ۱۴۱۰۵۵۴۰۰ مربع میل ہے۔

زمین کی مجموعی آبادی ..... ۲۴۰۰ نفوس پر مشتمل ہے۔

آبادی کا اوسط ۹ و ۲۴ فی مربع میل ہے۔

زمین کا بلند ترین حصہ ایورسٹ پہاڑ کی چوٹی ہے جس کی بلندی ۲۹۱۴۱ فٹ ہے۔

زمین کا سب سے زیادہ نشیبی حصہ بحرِ مُردہ کا ساحل اور فلسطین ہے جو سطحِ آب سے ۱۲۹۲ فٹ نیچا ہے۔
سمندر کی سب سے زیادہ گہرائی بحرالکاہل میں فلپین کے قریب ۱۲۹۲ فٹ ہے۔

مطبوعات موصولہ

(تبصرہ کے لئے دو کاپیاں بھیجنا ضروری ہیں)

مختصر تاریخ ہند ترجمہ ہے ڈبلو - ایچ - مارلینڈ اور اے - سی، چٹرجی کی انگریزی کتاب "شارٹ ہسٹری آف انڈیا" کا جسے پروفیسر محمد یوسف کوکن (مدراس یونیورسٹی) نے اُردو میں کیا ہے -

مورلینڈ، آئی، سی، اس طبقہ کے بہت ممتاز فرد تھے اور یو-پی میں مختلف اہم خدمات انجام دینے کے بعد جب ۱۹۲۷ء میں پنشن ہوئی تو تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے اور تاریخ کی کتابیں تصنیف کیں جن میں ایک "مختصر تاریخ ہند" بھی تھی - یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۳۶ء میں شایع ہوئی اور جب اس کے دو سال بعد مورلینڈ کا انتقال ہوا تو اے - سی چٹرجی نے جو خود بھی آئی، سی، اس تھے اور نہ صرف یو-پی بلکہ مرکزی حکومت میں بھی اہم خدمات انجام دے چکے تھے، مورلینڈ کی اس کتاب پر نظر ثانی کی اور کئی ابواب کا اضافہ کرکے ۴۴ء میں اسے شایع کیا -

مدراس یونیورسٹی ہر سال خاص خاص علوم و فنون کی کتابیں ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کرا کے شایع کرتی رہتی ہے، انھیں میں سے ایک کتاب یہ ہے جس کا ترجمہ کرنے کی خدمت پروفیسر محمد یوسف کوکن کے سپرد کی گئی تھی -

یہ کتاب ۵۲ ابواب پر مشتمل ہے جس میں قدیم ہند سے لیکر ۱۹۴۲ء تک کے تمام اہم سیاسی، اقتصادی اور تمدنی حالات پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے -
سب سے پہلے ہندوستان کے قدیم باشندوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اس کے بعد وادیٔ سندھ کے تمدن اور آریہ قوم کی آمد کا - پھر موریہ حکومت، یونانیوں کا حملہ، گپت خاندان کا ذکر کرکے ہرش سے محمود غزنوی تک کے حالات پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اس کے بعد تمام مسلم حکمراں خاندانوں کا ذکر مغل سلطنت کے زوال تک کیا گیا ہے -

اس کے بعد کلائیو، وارن ہسٹنگز، کانواس، ولزلی، بنٹنک اور ڈلہوزی کی حکومتوں پر تبصرہ کرتے ہوئے غدر اور اس کے نتائج پر روشنی ڈالی ہے -
اخیر کے تیرہ ابواب بہت اہم ہیں جن میں ۱۸۶۱ء سے ۱۹۰۵ء کی اقتصادی و ثقافتی تاریخ کے علاوہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۴ء تک کے سیاسی اضطرابات پہلی جنگ عظیم کے نتائج اور ۱۹۱۹ء سے ۱۹۴۲ء تک کے دستوری مسایل، اقتصادی و سماجی ترقیوں پر بڑی فاضلانہ روشنی ڈالی گئی ہے -

ترجمہ کی خوبی کے متعلق غالباً اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ یہ ترجمہ ہے تو وہ اسے اصل تصنیف تسلیم کرنے میں تامل نہیں کر سکتا - ترجمہ نہایت صاف، شگفتہ، مربوط اور بامحاورہ ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ فاضل مترجم نے سیکڑوں صفحات کا ترجمہ کیونکر چند ماہ کے اندر پورا کر لیا -
کتاب میں دس نقشے بھی دیدئے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے مختلف زمانوں میں ہندوستان کے سیاسی و طبعی جغرافیہ کا بھی سامنے آجاتا ہے - ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ ساری کتاب نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور خاص اہتمام سے دیدہ زیب مجلد شایع کیا گیا ہے -
ہم کو مدراس یونیورسٹی اور فاضل مترجم دونوں کا شکر گزار ہونا چاہئے کہ ان کی وساطت سے ایسی قابلِ قدر کتاب ملک کو ہاتھ آئی - قیمت پندرہ روپیہ ہے جو اس کے تمام معنوی و ظاہری محاسن کے لحاظ سے واقعی کم ہے -

نامعلوم انسان اُردو ترجمہ ہے ڈاکٹر الکسس کیرول (ALEXIS CARREL) کی کتاب "MAN THE UNKNOWN" کا جسے مدراس یونیورسٹی نے سائنٹفک کتابوں کے ترجمہ میں شامل ہے -
یہ کتاب ڈاکٹر موصوف کی بہت مشہور کتاب ہے جس میں انھوں نے انسان اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر عالمانہ گفتگو کی ہے اور تمدن جدید کے

غلط طرزِ فکر کو نمایاں کیا ہے - یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے، جس میں انھوں نے علم انسانی، اور انسان کی دماغی و جسمانی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ ہمارا جدید تمدن بڑی غلط چیز ہے اور مشینی ترقیاں انسانیت کی صحیح منزل کی طرف کبھی نہیں پہونچا سکتیں، ان کا خیال ہے کہ انسان کو نہ صرف اپنے جسم بلکہ روح کی ترقی کی طرف بھی توجہ کرنا چاہئے تاکہ وہ موجودہ گمراہ کن اصول تمدن و ترقی سے مغلوب ہوکر اپنی اُن انفرادی و اجتماعی خصوصیات کو جو فطرت نے اسے ودیعت کی ہیں تباہ و برباد نہ کردے۔

اس کتاب کا آخری باب جس میں انھوں نے "انسان کی تعمیر جدید" سے بحث کی ہے - بڑا دلچسپ باب ہے اور نہایت عمیق مطالعہ چاہتا ہے۔

ترجمہ، پروفیسر محمد یوسف کوکن اور محمد محی الدین صاحب کی متحدہ کوششوں کا نتیجہ ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ایسی مشکل علمی کتاب کا اتنا صاف و شگفتہ ترجمہ تصور میں نہ آسکتا تھا۔ علمی اصطلاحات کا ترجمہ بڑی مشکل چیز ہے لیکن فاضل مترجمین نے اس میں بھی نہایت اعتدال سے کام لیا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا کہ اگر ساتھ ہی ساتھ فٹ نوٹ یا علٰحدہ ضمیمہ کی صورت میں ان اصطلاحات کے مفہوم کی صراحت بھی کردی جاتی -

یہ کتاب بھی نہایت دبیز کاغذ پر ٹائپ میں شایع کی گئی ہے اور تقریباً ۴۰۰ صفحات کو مشتمل ہے - قیمت پندرہ روپیہ ہے اور مدراس یونیورسٹی سے مل سکتی ہے

تاریخ ہند جلد اول تالیف ہے پروفیسر نواب علی قریشی (حلیم مسلم کالج کانپور) کی، انٹرمیڈیٹ اور بی۔ اے کے طلبہ کے لئے۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں تاریخ ہند کے اس دور سے بحث کی گئی ہے جو موہنجوڈارو اور ہڑپا کا دور کہلاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب موریہ اور گپت فرمانرواؤں کے بیان میں ہندوستان کی ذہنی ترقی پورے عروج پر تھی اور اس کا سیاسی، تمدنی و ثقافتی نظام ایک خاص نہج پر قایم تھا یہ حصہ عہد قبل تاریخ سے شروع ہوکر بارھویں صدی تک کے حالات پر مشتمل ہے، دوسرے حصہ میں بارھویں صدی سے سولھویں صدی کے آغاز تک کے حالات و واقعات قلمبند کئے گئے ہیں -

یہ کتاب ۳۲ ابواب میں منقسم ہے جن میں عہد قبل تاریخ، آریوں کی آمد، ویدوں کے زمانہ کی تہذیب، جینی و بودھی عہد کی حکومتیں، ایرانی و یونانی حملے موریہ و گپت خاندان کی حکومتیں، قنوج کی سلطنت، راجپوت دور کا تمدن، مذہبی نشاۃ الثانیہ، مسلمانوں کی آمد اور ان کے مختلف حکمرانوں خاندانوں کے حالات ابتداء عہد مغلیہ تک اور صوبائی مسلم حکومتوں کے حالات نہایت خوبی و وضاحت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں - اخیر کے دو ابواب میں مسلم سلاطین کے انتظام حکومت اور ان کے عہد کے معاشی و سماجی حالات پر نہایت دلچسپ تبصرہ کیا گیا ہے اور متعدد نقشوں کے ذریعہ سے مختلف زمانوں کے ہندوستان کا جغرافیہ بھی پیش کردیا گیا ہے جن سے تاریخی واقعات اور جغرافی تغیرات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے -

زبان و انداز بیان نہایت صاف و شگفتہ ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب نہ صرف طلبہ بلکہ تاریخ کا ذوق رکھنے والے تمام ان حضرات کے لئے بھی بہت مفید ہے جو بڑی بڑی کتابیں پڑھنے کی فرصت و سہولت نہیں رکھتے -

امید ہے کہ فاضل مولف نے جس محنت و مورخانہ کاوش سے کام لیا ہے اس کی کافی قدر کی جائے گی اور پبلشرس اس کا دوسرا حصہ بھی جلد شایع کرسکیں گے۔

کتاب نہایت نفیس کاغذ پر بڑے اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور پانچ روپیہ میں کتاب گھر پریڈ کانپور سے مل سکتی ہے -

مشرقی بنگال میں اُردو تصنیف ہے پروفیسر سید اقبال عظیم (صدر شعبۂ اُردو چاٹگام گورنمنٹ ڈگری کالج) کی جس میں انھوں نے مشرقی پاکستان کے قدیم و جدید ۲۱۲ اہلِ قلم کا تذکرہ قلمبند کرتے ہوئے مشرقی بنگال کے لسانی مسایل پر بھی ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے -

"مشرقی بنگال" کے ساتھ اُردو کی نسبت بہت عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہندوستان کی زبانوں میں، بنگالی ہی وہ زبان ہے جس نے عربی و ایرانی تاجروں کے میل جول کی وجہ سے اول اول غیر ملکی زبانوں کے الفاظ کو قبول کیا اور اس طرح اس زبان کی بنیاد ڈالی جسے بعد کو اُردو کے نام سے موسوم کیا گیا، جس کا ثبوت سولھویں صدی عیسوی کی بعض بنگالی تحریروں سے بہ آسانی مل سکتا ہے اور جس کا ذکر فاضل مصنف نے تفصیل کے ساتھ اپنے دیباچہ میں کیا ہے -

اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلا حصہ "افسانۂ دوش" ہے جس میں دور ماضی کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے - دوسرا حصہ "ذکر امروز" جو عہد حاضر کے اہل قلم کے حالات پر مشتمل ہے، اور تیسرے حصہ "فکر فردا" میں ان مسایل پر گفتگو کی گئی ہے جو مشرقی بنگال میں ترویج اُردو سے تعلق رکھتے ہیں۔

پہلے حصہ میں چھوٹے بڑے ۱۵۵ ایسے شعراء کا ذکر کیا گیا ہے جو اب موجود ہیں اور تیسرے حصہ میں عہدِ حاضر کے اخبارات و رسایل، ادبی انجمنوں، مشاعروں اور دوسری تحریکات کا ذکر ہے جو مشرقی بنگال میں اُردو کی ترویج و ترقی سے تعلق رکھتی ہیں۔

اس وقت تک اُردو شاعروں کے متعدد تذکرے مرتب ہو چکے ہیں، لیکن ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جن میں بنگال کی طرف توجہ کی گئی ہو۔ اس لئے پروفیسر اقبال عظیم کا یہ تذکرہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فاضل مصنف نے ان تمام شعراء کے حالات اور ان کا کلام فراہم کرنے میں بڑی محنت و کاوش صرف کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ملک ان کی اس محنت کی قدر کرے گی، کتاب نہایت اہتمام سے مجلد شایع کی گئی ہے اور متعدد تصاویر دیکر اس کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا گیا ہے۔

یہ کتاب سات روپیہ آٹھ آنے میں، مشرق کوآپریٹو پبلی کیشنز، ۹۷ آغا صادق روڈ ڈھاکہ سے مل سکتی ہے۔

ساحل اور سمندر

مذاکرات ہیں پروفیسر سید احتشام حسین رضوی کے جو سیاحت مغرب کے دوران میں انھوں نے قلمبند کئے تھے۔ پروفیسر موصوف کو راکفلر اسکالرشپ پیش کیا گیا تھا اور اسی سلسلہ میں انھوں نے امریکہ و یوروپ کا یہ سفر کیا تھا۔ اس اسکالرشپ کا مقصود یہ تھا کہ ہندوستان کی ادبی زندگی کی تنظیم اور اچھی کتابوں کی اشاعت میں امریکی و یوروپی اداروں سے جو مدد مل سکتی ہے ان پر غور کیا جائے۔ یہ سفر احتشام صاحب نے ۲۹ اگست ۵۲ء کو شروع کیا اور ۹ جولائی ۵۳ء کو ختم اور اس دوران میں انھوں نے امریکہ اور یوروپ کے مختلف علمی اداروں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور کتب خانوں کو دیکھ کر اور وہاں کے اکابر علم و ادب سے ملنے کے بعد اپنے تاثرات کو قلمبند کیا جو "ساحل اور سمندر" کے نام سے شایع کئے گئے ہیں۔

احتشام صاحب مفکر قسم کے انسان ہیں اور چونکہ ایک مفکر ہمیشہ سنجیدہ، متین اور بڑی حد تک متشائم ہوا کرتا ہے اس لئے اس کتاب میں بھی یہ کیفیت ہر جگہ نظر آتی ہیں۔ انھوں نے یہ سفر دھڑکتے ہوئے دل سے شروع کیا تھا اور اسی عالم میں اسے ختم کیا، جس کا ثبوت اس سیاحت نامہ کے ایک ایک لفظ سے ملتا ہے لیکن باوجود اس "ولے برندش" قسم کی سیاحت کے انھوں نے اپنی فطری خصوصیات مطالعہ کو ہاتھ سے نہیں دیا اور ہر ہر چیز کا بہت مفکرانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا۔

ہندوستان والوں کے لئے امریکہ و یوروپ کا سفر زیادہ تر نشاط آور پہلو رکھتا ہے، لیکن احتشام صاحب کی یہ سیاحت خالص "فکر انگیز" تھی اور اس میں کوئی شائبہ کسی ایسی خواہش یا تمنا کا نہ تھا جو محض سطحی تفریح یا رعایتِ چشم و گوش سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے یہ سیاحت نامہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بیک وقت علمی و ادبی رپورتاج بھی ہے اور ماتم آرزو بھی۔

یہ سیاحت نامہ جس لب و لہجہ میں لکھا گیا ہے اس کو دیکھ کر یہ پتہ چلتا ہے کہ دوران سیاحت میں کبھی کبھی اپنے اندر "فکر فضول اور جرأت رندانہ" کے فقدان کا احساس بھی انھیں ہوا ہے لیکن انھوں نے اپنے دل کو زیادہ مچلنے نہیں دیا اور اپنی "نارسائیوں" کا ذکر بھی انھوں نے اس طرح کیا ہے گویا ساری دنیا "گوش نصیحت نیوش" ہے — اس میں شک نہیں کہ احتشام صاحب بڑے ضبط و صبر والے انسان ہیں۔

اس سیاحت نامہ کو اگر اس خیال سے نہ دیکھا جائے کہ احتشام صاحب نے کیا دیکھا اور کیا سنا، حالانکہ اس اثر پذیری سے مفر نہیں تو بھی اپنے انداز تحریر کے لحاظ سے یہ ایک ادبی شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ ضخامت ۲۶۸ صفحات - سائز کتابی - کاغذ و طباعت وغیرہ پسندیدہ - قیمت چار روپیہ اور ملنے کا پتہ: سید وجاہت حسین - بارود خانہ - لکھنؤ۔

ادب اور نظریہ

چوتھا مجموعہ ہے پروفیسر سرور کے تیرہ انتقادی مقالات کا جن میں ۹ مختلف رسایل میں شایع ہو چکے ہیں اور چار غیر مطبوعہ ہیں - مطبوعہ مقالات میں نظیر اور عوام، غالب کا ذہنی ارتقاء، اقبال کی عظمت، خصوصیت سے مطالعہ کے قابل ہیں جن میں اُن بہت سی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے جو نظیر، غالب اور اقبال کی شاعری کے صحیح اقتدار متعین کرنے میں نقادوں نے پیدا کردی ہیں۔ اقبال سرور کا خاص موضوع ہے اور ہر چند اس کا مطالعہ انھوں نے زیادہ تر "رشتۂ در گردنم افگندہ دوست" کی حیثیت سے کیا ہے لیکن "می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست" سے بچنے کی کوشش بھی انھوں نے جا بجا کی ہے اور جذبات کے سیلاب میں پاؤں زیادہ اُکھڑنے نہیں دئے۔ نظیر پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ایک نوع کی معذرت (APOLOGY) ہے ان تمام نقادوں کی طرف سے جنھوں نے نظیر کے سمجھنے

میں انصاف ہاتھ سے دیدیا تھا۔ غالب کے متعلق جو اظہار خیال انھوں نے کیا ہے اس سے نہ صرف ان کی غالب شناسی بلکہ خود ان کے شاعرانہ ذوق کی پاکیزگی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ غالب کے ذکر کے ساتھ بیدل کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ غالب کی رومانیت انھیں بیدل کی رمزیت تک لے گئی لیکن غالباً زیادہ صحیح ہوتا اگر رومانیت کی جگہ "اشکال پسندی" اور معنی آفرینی کا ذوق اس کا سبب قرار دیا جاتا، کیونکہ وہ چیز جو سرور صاحب کو بیدل کے یہاں "رومانیت" نظر آتی ہے، وہ رومانیت نہیں بلکہ "خونے بہ جگر جمع رکن در رنگِ بروں آ" کی کیفیت تھی جس سے غالب ناآشنا تھے اور اسی لئے وہ بیدل کا ساتھ نہ دے سکے۔

"نئے ہندوستان میں اُردو کا مستقبل" ان کا بڑا معرکۃ الآرا مقالہ ہے جس میں ان کے انتقاد نے سماجی سوجھ بوجھ کی حیثیت اختیار کرلی ہے، اسی طرح ادب اور نظریہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک بڑے معتدل محاکمہ کی صورت رکھتا ہے جو ادب کے قدیم و جدید رجحانات کی موجودہ کشمکش دور کرنے میں بڑی حد تک معاون ہو سکتا ہے۔

مطبوعہ مقالات میں "رشید احمد صدیقی" شخصی مطالعہ ہے اور خوب ہے۔ سہیل کی شاعری پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ بھی بڑی حد تک درست ہے لیکن یہ حقیقت کہ سہیل صرف نظم و قصیدہ کے شاعر تھے اس کا اظہار سرور کے قلم سے کسی جگہ نہیں ہوا۔

جوش کے مجموعۂ کلام "سرود و خروش" پر بھی ان کی رائے بہت متوازن ہے، لیکن ان کا یہ کہنا کہ "جوش مذہب کے نام ہی سے بیزار ہیں"، جس حد تک خدا اور رسول کا تعلق ہے سرور کا یہ خیال صحیح ہے لیکن اگر مذہب میں خدا اور رسول کے علاوہ کچھ اور اجزاء بھی شامل ہیں تو سرور کا یہ ارشاد درست نہیں کیونکہ جوش بدستور اپنے آبائی عقیدۂ تشیع پر قایم ہیں ظاہری نہیں تو "باطنی" طور پر اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر اگر ان کی شاعری کی "پشت و رُو" کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی تلخ نگاری کی نفسیاتی حقیقت سامنے آسکتی ہے۔

یہ مجموعہ "انتقادی ادب" میں ایک اہم اضافہ ہے اور سرور ایسے قدر اول کے نقاد کی طرف سے ہم کو ایسے ہی اضافہ کی توقع تھی۔

ضخامت ۲۹۶ صفحات، کاغذ و طباعت وغیرہ پسندیدہ۔ قیمت ہے اور ملنے کا پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ۔

اُردو تنقید کی تاریخ تصنیف ہے مسیح الزماں صاحب لکچرر الہ آباد یونیورسٹی کی جس میں انھوں نے اُردو میں تذکرہ یا تنقید نگاری کی تاریخ سے بحث کی ہے۔ پہلے انھوں نے عربی فارسی کے اصول نقد بتائے ہیں اور پھر اُردو میں تنقید کے تین دور قایم کرکے ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

پہلے دور میں انھوں نے فائز، آبرو، شاہ حاتم، سودا اور باقر آگاہ کے تذکروں کا ذکر کیا ہے، دوسرے دور میں میر کے نکات الشعراء اور مصحفی کے تذکرہ پر اظہار خیال کیا ہے اور تیسرے دور میں گلزار ابراہیم، گلشنِ ہند اور انشاء پر گفتگو کی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مسیح الزماں صاحب نے اس کی تالیف و ترتیب میں کافی محنت و کاوش سے کام لیا ہے اور جا بجا جو رائیں انھوں نے دی ہیں یا جن نتائج تک وہ پہونچے ہیں، وہ خود ان کے ذاتی غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔

تنقید نگاری کے سلسلہ میں سب سے پہلے ہمارے سامنے دور تذکرہ نگاری آتا ہے، اور اسی کو سامنے رکھ کر ہم نقد و تبصرہ کے تدریجی منازل کو متعین کرسکتے ہیں لیکن افسوس ہے کہ اس حقیقت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ مسیح الزماں صاحب طبعاً و فکراً نقاد ہیں، لیکن انھوں نے "تشریح و جراحی" سے پہلے ضروری سمجھا کہ وہ اُن آلات کو بھی فراہم کرلیں جن سے جراحی میں کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

اس حصہ میں ابتدا سے ۱۸۸۰ء تک کے تذکروں کا جایزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد جیسا کہ انھوں نے ظاہر کیا ہے، دوسری جلد میں ۵۷ء کے بعد سے عہدِ حاضر کے تنقیدی مواد پر روشنی ڈالیں گے، تیسری جلد میں ترقی پسندانہ تنقیدی ادب پر گفتگو کریں گے اور اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہوگئے تو یقیناً بڑا مفید لٹریچر ہمارے سامنے آجائے گا۔ یہ کتاب ۲۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور تین روپیہ میں خیابان۔ ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد سے مل سکتی ہے۔

نقوشِ مانی - نگارستانِ مانی حضرت مانی جائسی کی غزلوں اور نظموں کے مجموعے ہیں، جنھیں گلاب سنگھ اینڈ سنز پبلشرز دہلی نے شایع کیا ہے (قیمت ڈھائی روپیہ)

پہلا مجموعہ نقوش مانی ۳۱ء تک کے کلام پر مشتمل ہے اور نگارستان مانی میں ۵۲ء تک کا کلام پایا جاتا ہے۔ پہلے مجموعہ میں ۸۹ غزلوں کے علاوہ ۲۲ نظمیں بھی ہیں اور غالب کی غزلوں پر اور سات تضمینیں بھی۔ دوسرے مجموعہ میں ۶۷ غزلیں ہیں، سات نظمیں اور تین تضمینیں۔ قطعات تاریخ ان کے علاوہ ہیں

نقوش مانی میں سب سے پہلی نظم ۱۹۱۳ء کی اور سب سے پہلی غزل ۱۹۱۴ء کی نظر آتی ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان کی شاعری کی ابتداء اس سنہ سے ہوئی ہے۔ اس سے قبل وہ اپنے کلام کے دو مجموعے ضایع کر چکے تھے۔ اس صراحت سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کی شاعری کی عمر کسی طرح ۵۰ سال سے کم نہیں ہے اور اس نصف صدی کے دوران میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ اگر سب فراہم ہو سکتا تو کئی مجموعے اس وقت تک شایع ہو چکے ہوتے۔ ان مجموعوں کی ابتداء میں جناب مانی نے اپنے اور مختلف ادوار شاعری کے حالات بھی قلم بند کر دئے ہیں، جن سے ان کے رجحان طبع، ان کی غیر معمولی ذہانت اور فطری میلان شاعری پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

جناب مانی کی شاعری اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب دبستانِ لکھنؤ کی خارجی شاعری عروج پر تھی اور اس ماحول میں نشو و نما پانے کی وجہ سے انھیں بھی قدرتاً یہی رنگ اختیار کرنا چاہیئے تھا، لیکن کس قدر حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ اس وقت بھی مانی کی شاعری کا مزاج یہ تھا:

کسی کی آنکھ سے افسانۂ غم پر جو نکلا ہو — جزائے صد ہزار آلام ہے اس ایک آنسو میں
نہیں فرصت نہ ہوگی کشمکشہائے تمنا سے — مگر جی چاہتا ہے یہ کہ تم ہو میرے قابو میں

اجازت دیجئے رونے کی ابتو دل کی حالت پر — بہت اچھا ہے آمادہ ہوا ترکِ محبت پر
امید افزا کوئی صورت نہ تسکیں کا کوئی پہلو — نتیجہ کیا وہ قایم ہی سہی عہدِ محبت پر

زمانِ ہجر ہے اب جرم بیتابی سے کیا ڈرنا — یہی الزام عہدِ وصل میں تھا اور ہمیں پر تھا

جناب مانی نے غالباً کسی کا تلمذ اختیار نہیں کیا اور شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی، کیونکہ ان کے ابتدائی کلام میں بھی کافی پختگی نظر آتی ہے اور ابتداء ہی سے انھوں نے بہت پھونک پھونک کر اس کوچہ میں قدم رکھا۔ ان کی شاعری مکسر جذبات و تاثرات لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کی شاعری ہے اور اسی لئے ان کی نظمیں بھی بڑے لطیف رنگ تغزل میں رچی ہوئی نظر آتی ہیں۔

مانی کی قدرت سخنگوئی کا اندازہ ان کی تضمینوں سے ہوتا ہے کہ غالب کی بعض نہایت مشکل زمینوں میں بھی انھوں نے ایسے چست و متوازن مصرعے نکالے ہیں کہ ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

مانی نہایت ہوش و گوش والے شاعر ہیں اور باوجود والہانہ غزل گوئی کے جذبات کی رو میں متانت و سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں دیتے، اسی لئے ان کے یہاں عمومیت یا سوقیت کا پتہ نہیں اور ان کا ستھرا ذوق ان کے ہر ہر شعر سے نمایاں ہے۔ حضرت مانی غالب کے پرستاروں میں ہیں، لیکن اس ذوق پرستاری میں انھوں نے اپنی انفرادیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اپنا رنگ سب سے علحدہ پیدا کیا جس میں ان کا سہیم و شریک ہمیں مشکل ہی سے مل سکتا ہے۔ عرصہ ہوا میرے ان کے ایک مشترک دوست نے مانی کی شاعری کے متعلق میری رائے صرف ایک فقرہ میں چاہی تھی اور میں نے بے اختیار کہدیا تھا کہ: "مانی بڑا شریف شاعر ہے" اور اگر شرافت کے وسیع مفہوم کو سامنے رکھا جائے جس میں شایستگی، اعتدال، رکھ رکھاؤ، سبھی کچھ شامل ہے تو ہر وہ شخص جو کلام مانی کا مطالعہ کر چکا ہے، غالباً یہی رائے قایم کرے گا۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ذرے افسانے سناتے ہیں کہیں تم تو نہیں — جانِ عالم یہ تمہارا ہی تکلم تو نہیں
نظم یہ بزم میں بے صاحب محفل کیسا — نگراں پردہ ہی پردہ میں کہیں تم تو نہیں
جلوہ گر بھی وہ اگر ہوں تو کہاں تاب نظر — طالب دید ترے ہوش کہیں گم تو نہیں
موت اک مژدۂ جاں بخش بنی جاتی ہے — کون دامن کی ہوا دینے لگا تم تو نہیں

افسوس ہے کہ ان مجموعوں کی کتابت میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں اور کاغذ بھی اچھا استعمال نہیں کیا گیا۔

شیشے کے گھر قرۃ العین حیدر کے بارہ نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مکتبۂ جدید لاہور نے نہایت اہتمام کے ساتھ مجلد شایع کیا ہے (قیمت چھ روپیہ)

قرۃ العین حیدر جدید نسل کے افسانہ نگاروں میں ایک خاص منزل و موقف رکھتی ہیں۔ منزل کی خصوصیت یہ کہ وہ اتنی جوان نہیں کہ انھیں خالص ترقی پسندی کے بحرانی دور کی پیداوار کہا جائے اور موقف کی خصوصیت یہ کہ جدید افسانہ نگاری کے میوزیم میں ان کی تصویر بھی بہت نمایاں نظر آتی ہے۔

اس سے قبل قرۃ العین کے دو ناول "میرے بھی صنم خانے" اور "سفینۂ غم دل" شایع ہو چکے ہیں جن کی جدید تکنک کو بعض لوگوں نے پسند کیا اور بعض نے ناپسند، لیکن افسانوں کی صورت میں غالباً "شیشے کا گھر" ہی ایک ایسا مجموعہ ہے جو ایک حد تک "فارغ از اندیشۂ سنگ باری" شایع کیا جا سکتا تھا۔

"قرۃ العین حیدر" مغربی اداؤں کی بہت دلدادہ ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتی ہیں کہ ان کی یہ دلدادگی "مشرق نژاد" ہونے کی وجہ سے ایک "سوزِ ناتمام" اور "نالۂ کوتاہ" سے زاید نہیں، اس لئے وہ اپنی "نارسائی" کی تلافی زیادہ تر فسانوں کے ذریعہ سے پورا کرتی رہتی ہیں جن کا کینڈا اور لب لہجہ اکثر و بیشتر مستعار ہوتا ہے۔ اس مجموعہ میں یہ "اثر پذیری" زیادہ نمایاں ہے، غالباً اس لئے کہ آج کل وہ جسمانی حیثیت سے بھی اسی سرزمین میں ہیں جو ذہنی حیثیت سے ہمیشہ ان کی "جولانگاہِ خیال" رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی ایسی تحریر کو جو "جسم و جان" دونوں کے اتحاد کا نتیجہ ہو اچھا ہونا ہی چاہئے۔

ہر چند قرۃ العین کی ذہنی رفتار اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، لیکن "اندازِ گفتار" میں ضرور کچھ تبدیلی نظر آتی ہے اور اس اچپلاہٹ میں کچھ کمی ہو گئی ہے جو صرف "ڈرائنگ روم" کی چیز ہے، "ریڈنگ روم" کی نہیں۔

بہر حال "شیشے کا گھر" دیکھنے کی چیز ہے اس لحاظ سے بھی کہ وہ "کارگاہِ بینائی" ہے اور اس حیثیت سے بھی کہ

رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

شاید کہ بہار آئی ناول ہے جناب علی عباس حسینی کا جسے کتابی دنیا لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ حسینی صاحب افسانہ نگار بھی ہیں اور ناول نگار بھی، لیکن غالباً افسانہ نگاری ان کا خاص فن ہے جس میں ان کی شہرت و کامیابی زیادہ مسلّم ہے۔

معلوم نہیں یہ ناول ان کا نیا ہے یا پرانا، پہلی مرتبہ شایع ہو رہا ہے یا دوسری مرتبہ، لیکن اس سے قبل میری نگاہ سے نہیں گزرا اور اسی لئے میں نے اسے بہت غور و دلچسپی سے پڑھا۔ پلاٹ دلچسپ ہو یا نہ ہو لیکن اگر واقعات کو قرینہ کے ساتھ سمیٹ لیا جائے تو بھی ناول کامیاب ہو سکتا ہے — اس ناول کا پلاٹ بھی دلچسپ ہے اور جس تدریج کے ساتھ واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ بھی بڑی حد تک "فنکارانہ" ہے۔ "مکالموں" میں البتہ کہیں کہیں جھول نظر آتا ہے، لیکن نہ اس حد تک کہ پڑھنے والے کی پیشانی "شکن آلود" ہو جائے۔ حسینی صاحب سماجی افسانہ نگار ہیں اور "ادب برائے زندگی" کے قایل۔ اسی لئے ہم کو ان کے افسانوں میں بہت سی چونکا دینے والی باتیں بھی مل جاتی ہیں اور اگر ہمارا احساس تیز ہو جائے تو ہم ان سے معاشرہ کی اصلاح کا بھی کام لے سکتے ہیں — ضخامت ۲۱۰ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

مزید حماقتیں مجموعہ ہے شفیق الرحمان صاحب کی بعض غیر مربوط تحریروں کا جنھیں "مربوط" شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ شفیق صاحب مشہور "مزاح نگار" ہیں اور اس سے قبل ان کی متعدد تصانیف شایع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں لیکن اس کتاب میں ان کے مزاحیہ رنگ نے ایک ایسے SURRERLIST آرٹ کی صورت اختیار کر لی ہے جس سے لطف اٹھانے کے لئے صرف فلاسفر کی ضرورت ہے یا نرے احمق کی اس لئے اگر ہماری طرح کوئی شخص فلسفی ہونے کے "رتبۂ بلند" تک نہیں پہونچ سکتا تو مجبوراً اسے اپنی حماقت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

"مرموزیت" اس عہد کے آرٹ کا "MOTTO" ہے جس میں موسیقی، نقاشی اور ادب سب شامل ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ یہ سکہ "نمبر ایک ادب" کی دنیا میں چل سکتا ہے یا نہیں — ہو سکتا ہے کہ شفیق الرحمان صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اس کا تجربہ کرنے کی کوشش کی ہو۔

مرموزیت — "از خود بروں آ" — نہیں ہے بلکہ — "ماہتاب" — کا مطالعہ ہے — "چاکِ گریباں" — سے لیکن اگر کوئی شخص کتاں کی جگہ "چاکِ دل" سے یہ مطالعہ کرنا چاہئے تو وہ یقیناً سائنٹسٹ ہے اور شفیق الرحمان صاحب نے ایک سائنٹسٹ ہی کی حیثیت سے اپنے آپ کو اس کتاب میں پیش کیا ہے، خدا کرے یہ تجربہ کامیاب ہو اور مزاح نگاری بھی "علوم حکمیہ" میں شامل ہو جائے۔ (قیمت چھ روپیہ)

حریم ناز مجموعہ ہے راجکماری سورج کلا سہائے سرور کی غزلوں کا جسے سنٹرل بک ڈپو الہ آباد نے خاص اہتمام سے شایع کیا ہے۔ راجکماری، راجہ سر اودھ نرائن سہریا کی صاحبزادی ہیں جن کی ابتدائی تعلیم اردو و فارسی کی بھوپال میں ہوئی اور اعلیٰ تعلیم علی گڑھ میں، لیکن "ذوق شعر و ادب"

ان کا خاندانی ورثہ ہے جس کی تکمیل انھوں نے اپنے چچا رائے بہادر منشی برج نرائن وزیر اعظم جینڈ سے جو ناظم تخلص کرتے تھے۔

سرور نے بہت کمسنی سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا لیکن ابتدائی کلام محفوظ نہ رہ سکا ورنہ ہمیں ان کے رجحانات شعری کے مدارج سمجھنے میں زیادہ مدد ملتی - یہ مجموعہ حال ہی کی غزلوں کا ہے اور مختصر ہے لیکن انکے شاعرانہ ذوق کے سمجھنے کے لئے ایک وسیع دفتر کا حکم رکھتا ہے - ان کی شاعری یکسر جذبات کی شاعری ہے، پاکیزہ تاثرات محبت کی ترجمان ہے اور نرم و لطیف لہجہ ان کا اندازِ بیان - چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

ہماری کشتیِ امید ساحل تک نہیں آتی — یہ کب تک موج و طوفاں میں رہیگی گفتگو برسوں

نظر ملا کے نظر سے جو دیدیا ساقی — اس ایک جام پہ قربان لاکھ میخانے

پتہ دیتی ہے خود صیاد یہ دل کی خلش ورنہ — مجھے یہ بھی نہیں ہے یاد کب فصل بہار آئی

تم دور تھے تو دل میں تھے ارمان سیکڑوں — اب سامنے ہو تم تو کوئی مدعا نہیں

طوفان مجموعہ ہے راجندر بہادر موج (وکیل فتح گڑھ) کی غزلوں اور رباعیوں کا جسے خود انھوں نے شایع کیا ہے، (قیمت مجلد دو روپیہ)

موج ایک نوجوان شاعر ہیں لیکن ان کی شاعری کا پس منظر کلاسیکل شاعری ہے۔ اور جدید شاعروں کی طرح وہ اپنے آپ کو فنی پابندیوں سے آزاد نہیں سمجھتے اور نہ شعر کو نثر سمجھ کر اس سے لطف لینے کے قایل ہیں۔ موج فتحگڑھ کے ایک علم دوست خاندان کے فرد ہیں اور بہت کمسنی میں شعر کہنے کا شوق ان کو پیدا ہوا جو عمر کے ساتھ بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ صاحب دیوان ہو گئے۔ وہ مشاعروں میں ضرور شریک ہوتے ہیں لیکن غزل اس لئے نہیں کہتے کہ اسے مشاعرہ میں پڑھنا ہے بلکہ اپنی فطری استعداد اور ذوق کی تحریک سے مجبور ہو کر کہتے ہیں۔

مآل بصیرت یہ کتاب جناب عطاء اللہ پالوی کے مذہبی مطالعہ کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے بعض اسلامی اعمال و عقاید پر بڑی سلجھی ہوئی رائیں ظاہر کی ہیں۔ اس کتاب میں انھوں نے مسلمان، مشرک، آدم، فدیہ، تزکیہ، امی وغیرہ متعدد اصطلاحوں پر بہت مفکرانہ روشنی ڈالی ہے اور اس وقت جبکہ اسلام اور روایاتی اوہام کے درمیان ایک دیوار حایل ہو گئی، ایسی کتابوں کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔ عطاء اللہ پالوی پکے مسلمان ہیں لیکن تقلیدی و روایتی نہیں، وہ اسلام کو ایک ایسے پیغام کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو ساری دنیا کو دیا گیا ہے اور اسی نقطۂ نظر سے وہ کلام اللہ اور اس کی تعلیمات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مذہبی مسایل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ کتاب بڑی مفید ثابت ہوگی۔ قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ: سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی۔

نادر روزنامچہ سندیلہ میں ایک بزرگ تھے مولوی سید مظہر علی جنھوں نے کامل ۴۵ سال تک بلاناغہ اپنا روزنامچہ لکھا اور اس میں وہ سب کچھ درج کر دیا جو انھوں نے دیکھا یا سنا۔ یہ روزنامچہ ۱۸۶۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۱ء پر ختم ہوتا ہے اور خدا جانے کتنی مقامی و غیر مقامی معلومات اپنے اندر رکھتا ہے۔

ڈاکٹر نور الحسن صاحب ہاشمی جو خود بھی سندیلوی ہیں، اسی روزنامچہ کا اقتباس اس نام سے مرتب کیا ہے جو ۳۰۸ صفحات کو محیط ہے۔ یہ روزنامچہ دراصل ایک تاریخی دستاویز ہے جس سے ہمارے صوبہ بلکہ سارے ہندوستان اور بیرونِ ہند کے بعض حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے ابتدا میں ایک مقدمہ لکھ کر روزنامچہ نویس کے خاندانی حالات اور ان کے مشاغل کا ذکر بھی کر دیا ہے جس سے اس روزنامچہ کی صحیح روح سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے - اس روزنامچہ کو انوار بک ڈپو لکھنؤ نے مجلد شایع کیا ہے۔ ضخامت ۳۰۸ صفحات - قیمت عہ

پیغمبر اسلام غیر مسلموں کی نظر میں اس کتاب میں جناب ظل عباس عباسی نے رسول اللہ کے متعلق ۲۵ غیر مسلم حضرات کی رائیں یکجا کر دی ہیں، جن میں ۷ یوروپین اور باقی ہندوستان ہی کے اہل فکر و نظر ہندو ہیں۔

عباسی صاحب کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کتاب کے ذریعہ سے غیر مسلم اقوام کی اس وحشت کو دور کریں جو اسلام و بانی اسلام کا نام سنکر ان میں پیدا ہوتی ہے، لیکن انھوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ جس چیز کو مذہبی عصبیت کہا جاتا ہے وہ محض قومی عصبیت ہے اور اسکے دور کرنے کے لئے محمدؐ کے کردار کو سمجھانے کی ضرورت نہیں بلکہ خود اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم عباسی صاحب نے تبلیغی حیثیت سے ایک اچھی

خدمت انجام دی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔

مولوی ذکاؤاللہ دہلوی

ترجمہ ہے سی، اف، اینڈرروز کی کتاب کا جسے ان کے شاگرد ضیاءالدین احمد برنی نے کیا ہے۔ اینڈرروز، مولوی ذکاءاللہ خاں کے احباب میں سے تھے اور ان کی وفات کے بعد انھوں نے یہ کتاب لکھی تھی جس کے ترجمہ کی طرف ابتک کسی نے توجہ نہ کی تھی۔ مولوی ذکاءاللہ دہلی کالج کی اس علمی انجمن کے ایک فرد تھے جو ڈپٹی نذیر احمد، آزاد اور سرسید وغیرہ کے اجتماع سے بنی تھی اور انھیں کے ساتھ ختم ہوگئی مولوی ذکاءاللہ، تاریخ و ریاضی کے ماہر تھے اور تصنیف و تالیف کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے تاریخ ہندوستان نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی اور تہذیب الاخلاق کی وساطت سے ریاضی کی خدمت بھی انجام دیتے رہے۔

ضرورت تھی کہ ایسے صاحب فضل و کمال کی سیرت پر کافی تفصیل کے ساتھ لکھا جاتا لیکن افسوس ہے کہ اینڈرروز کے سوا کسی اور اہل قلم نے اس کی جرأت نہیں کی۔ ترجمہ کے ساتھ اگر برنی صاحب ان کی تصنیفی حیثیت پر بھی کچھ لکھ دیتے تو زیادہ مناسب تھا۔

ترجمہ بہت صاف و شگفتہ ہے اور متعدد تصاویر شامل کرکے اسے اور زیادہ دلچسپ بنادیا گیا ہے، ابتدا میں ڈاکٹر نذیر احمد کا دیباچہ بھی شامل ہے جو بجائے خود بڑی قابل قدر چیز ہے۔ قیمت ۱۲ اور ملنے کا پتہ: تعلیمی مرکز - ۱۰۵ گیدو مل، لیکھراج روڈ کراچی۔

اپنی موج میں

جناب آوارہ دہلوی کے چند خاکوں کا مجموعہ ہے جسے انوار بک ڈپو نے شایع کیا ہے اور یہ ہیں اس ادارہ سے مل سکتا ہے۔ دہلی کی ٹکسالی اردو میں بات چیت کرنا آوارہ کا خاص فن ہے اور اسی زمانہ میں انھوں نے متعدد خاکے پیش کئے ہیں جن میں مختلف پیشہ وروں کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ موجودہ "کتابی زبان" کے دور میں لوگ بہت سے ان محاورات و مصطلحات کو بھول چکے ہیں جو زبان کی جان ہیں اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس وقت جناب آوارہ سے زیادہ واقف اس زبان کا شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔

ان خاکوں میں بٹیر باز، مرغ باز، کبوتر باز اور پتنگ باز وغیرہ بہت سے باز شامل ہیں، ان کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو عوام سے قریب تر محسوس کرنے لگتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ جو زبان اتنی وسیع ہو وہ کیونکر فنا ہوسکتی ہے، بشرطیکہ ہم اس زبان کو بھول نہ جائیں۔ یہ خاکے اس میں شک نہیں بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہیں۔

ثنائے حبیب

جناب بہزاد لکھنوی کی نعتیہ غزلوں کا مجموعہ ہے جسے انوار بک ڈپو لکھنؤ نے حال ہی میں شایع کیا ہے۔ بہزاد مشہور شاعر ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں خاص کیفیت کے ساتھ کہتے ہیں۔ یہ غزلیں چونکہ نعتیہ ہیں اس لئے ان کی کیفیت بھی ان کی دوسری عاشقانہ غزلوں سے زیادہ گہری ہے، مثلاً:-

یہ شب ہی وہ میخانہ ہے جہاں مستوں کو مرادیں ملتی ہیں — کچھ ہوش لٹا کر جاتے ہیں کچھ ہوش لٹا کر آتے ہیں
بہزاد دو عالم کیا ہے میں کس کو بتاؤں کس سے کہوں — میں قدموں کو ان کے چومتا ہوں بطحا سے جو ہو کر آتے ہیں

نعت کہنے والوں میں شہیدی کا خاص مرتبہ تھا۔ اس کے بعد صمد الہ آبادی نے بھی بڑی والہانہ غزلیں اس رنگ میں کہیں۔ حمید لکھنوی بھی نعت گوئی میں بہت شہرت حاصل کرچکے ہیں، اب اس رنگ میں بہزاد ہمارے سامنے آئے ہیں اور کافی جذبات شیفتگی لیکر آئے ہیں۔ یقین ہے کہ ان کی یہ کوشش مقبول ہوگی۔

ہماری بت پرستیاں

۳۷ء کی بات ہے جب جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوشیار جنگ) کا ایک مقالہ اس عنوان سے نگار میں شایع ہوا تھا اس مقالہ میں انھوں نے مراسم تعزیہ داری و ماتمداری پر فلسفیانہ تبصرہ کرتے ہوئے صحیح اسوۂ حسینی کی طرف شیعی طبقہ کو متوجہ کیا تھا، لیکن چونکہ رسم پرستی کا اثر عوام و خواص دونوں پر بہت گہرا ہوتا ہے اس لئے۔ جناب اختر تلہری اور سید اولاد حیدر فوق بلگرامی ایسے حضرات نے بھی کچھ ایرادات اخبار الواعظ میں شایع کرائے۔

ان ایرادات کو دیکھ کر ہوش صاحب نے پھر ایک بسیط مقالہ اس موضوع پر لکھا، جسے وہ اس وقت تک شایع نہ کراسکے تھے۔ اب انھوں نے اصل مقالہ کے ساتھ ایرادات و جوابات بھی یکجا شایع کردئے ہیں، جن سے نہ صرف یہ کہ رسم تعزیہ داری پر موافق و مخالف رایوں کا علم ہمیں حاصل ہوتا ہے

بلکہ یہ بھی کہ مذہب کی دُنیا میں جب کوئی شخص عقل کی مشعل لیکر آتا ہے تو اس کو کیسی کیسی شدید تاریکیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہوش صاحب شیعی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بدقسمتی سے وہ روایتی شیعہ نہیں ہیں اور اس لئے اپنی حق گوئی کی وجہ سے اس جماعت میں کافی مطعون ہیں۔ خیر یہاں تک تو کوئی مضایقہ نہیں کہ ایک شخص بغیر کسی عقل و دلیل کے کسی خاص مسلک کا پابند ہو، لیکن عقل و ہوش کی گفتگو درمیان میں آنے کے بعد کورانہ تقلید کے جواز میں عقل و دلیل سے کام لینے کی کوشش کرنا بڑی عجیب بات ہے۔ ہوش صاحب نے مراسم تعزیہ داری کے خلاف جو کچھ لکھا تھا اس کا جواب اگر سکوت سے دیا جاتا تو زیادہ مناسب تھا کیونکہ اس بحث میں تلہری صاحب اور فوق صاحب نے عقل و مصلحت کی باتیں چھیڑکر معاملہ کو "کشفِ ساق" کی حد تک پہونچا دیا۔ جناب ہوش نے اس بحث میں تاریخ، روایت و عقل سبھی چیزوں سے کام لیا ہے اور ایسے "قطعیاتی" رنگ میں کہ اس کے خلاف زبان کھولنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی — یہ رسالہ میں سکریٹری نواب ہوشیار جنگ بہادر سے خیریت آباد حیدر آباد دکن کے پتہ پر ایک روپیہ میں مل سکتا ہے۔

بھیدی ترجمہ ہے برنارڈ شا کے مشہور طربیہ ڈرامہ "کینڈڈا" کا ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے قلم سے۔ برنارڈ شا، مغرب کا بڑا مشہور ڈرامہ نویس تھا جس نے اس فن کی نشاۃ الثانیہ کی اور تمثیل نگاری کی ایک بالکل جدید راہ پیدا کی جس کا ڈانڈا "تنقید عالیہ" سے ملتا ہے۔ شا کا یہ ڈرامہ بھی ایک سماجی تمثیل ہے جس میں اس نے "ازدواجی زندگی" کے مسایل پر بڑی فنکارانہ روشنی ڈالی ہے اور اسی لئے اس کا یہ ڈرامہ بہت مقبول ہوا۔

شا کے ڈراموں کا ترجمہ کرنا آسان نہیں کیونکہ اس کے الفاظ کے اندر جو ایک خاص روح کام کرتی رہتی ہے وہ مشکل ہی سے دوسری زبان میں منتقل ہوسکتی ہے، لیکن ہاشمی نے اس منزل کو بڑی خوبی سے طے کیا اور ترجمہ میں بھی بیان کی انھیں خصوصیات کو قایم رکھا جو اصل ڈرامہ کی جان ہیں۔ ابتداء میں ڈاکٹر احسن فاروقی نے برنارڈ شا کے فن تمثیل نگاری پر جو گفتگو کی ہے وہ بجائے خود بڑے کام کی چیز ہے اور وہ حضرات جو شا کی ڈرامائی روح کو سمجھنا چاہتے ہیں اس سے کافی استفادہ کرسکتے ہیں۔ یہ کتاب نسیم بک ڈپو لکھنو سے عہ میں مل سکتی ہے۔

تذکرۂ شعراء ابن امین اللہ طوفان

تذکرہ کی کتابوں میں یہ ایک نیا اضافہ ہے جو قاضی عبدالودود صاحب کی کاوش سے حال ہی میں ہوا ہے۔ قاضی صاحب بڑے زبردست محقق ہیں اور تاریخ و تذکرہ کی دنیا میں بال کی کھال نکالنا ان کا خاص فن ہیں۔ اس وقت تک ان کے متعدد تحقیقی مقالے قدیم شعراء پر شایع ہو چکے ہیں اور تاریخی چھان بین ان کا خاص ذوق ہے۔

یہ تذکرہ بھی انھیں کی دریافت ہے جسے انھوں نے اپنے حواشی کے ساتھ حال ہی میں شایع کیا ہے۔ یہ تذکرہ بہت مختصر ہے اور صرف اہم شعراء کا ذکر اس میں کیا گیا ہے، لیکن قاضی صاحب کے حواشی نے جو اصل تذکرہ سے حجم میں کئی گنا زیادہ ہے، اس کتاب کو بہت مفید بنا دیا ہے، افسوس ہے کہ اس کی کتابت میں صحت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے اور دوسرے اڈیشن میں اس نقص کو دور ہونا چاہئے — یہ تذکرہ ادارۂ تحقیقات اُردو پٹنہ سے عہ ۱۲ میں مل سکتی ہے۔

بشریت کا مقام بلند

مقالہ ہے مولانا مہر محمد خاں شہاب کا جس میں انبیاء کی کرداری خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں حقیقت وحی قرآن کی موجودہ ترتیب، روایت آدم، ناسخ و منسوخ وغیرہ پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ شہاب صاحب کسی وقت بہائی مسلک سے تعلق رکھتے تھے اور اب تک شاید یہ تعلق باقی ہو، اس لئے انھوں نے مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ بہت غایر نگاہ سے کیا ہے اور مذہبی تحقیق ان کا خاص مشغلہ ہے۔ چونکہ وہ بڑے سلجھے ہوئے خیال کے انسان ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے ہیں بڑے خلوص سے لکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی تحریروں میں بڑا وزن ہوتا ہے اور کوئی مناظرانہ اُلجھن نہیں ہوتی — یہ کتاب دراصل انھوں نے اس سوال کے جواب میں لکھی ہے کہ انبیاء سے گناہ سرزد ہوسکتے ہیں یا نہیں اور۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ یہ رسالہ اس سوال کا مسکت جواب ہے — یہ کتاب عباسی صاحب سے ذیل کے پتہ پر ۱۲ر میں مل سکتی ہے S.B. HIRJI GOVIND BLDG. BOMBAY

افکار اسلامی کی تشکیل جدید

اکیڈیمی آف اسلامک اسٹڈیز حیدر آباد دکن نے جس کے صدر ڈاکٹر سید عبداللطیف ہیں، ایک یادداشت اس تجویز کے ساتھ مشتہر کی تھی کہ قرآنی نظام فکر کو صحیح معنی میں متعین کرنے کے لئے احادیث کا از سر نو علمی جایزہ ضروری ہے اور اس باب میں مستشرقین مغرب اور اکابر علماء ہند سے مشورہ طلب کیا تھا۔

اس کے جواب میں چار علماء نے اس تجویز کی مخالفت کی، آٹھ علماء نے اس کو اس دلیل پر غیر ضروری قرار دیا کہ احادیث ظنی چیز ہیں اور قرآن کافی ہے ۳۸ علماء ہند اور سات مستشرقین مغرب نے اس تجویز کو بہت پسند کیا۔ اب اکیڈیمی نے انھیں جوابات کی بنیاد پر یہ کتاب شایع کی ہے جس میں ان تمام آرا کا ملخص پیش

کرکے اس تجویز کو عملی صورت دینے کے طریقوں پر غور کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ کام بڑا ضروری ہے اور نگار ۳۰ سال سے وہی کہہ رہا ہے جو اس اکاڈیمی نے کہا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ میں صرف کہتا تھا اور اکاڈیمی اب عملی صورتیں اختیار کر رہی ہے، جو اگر بروئے کار آگئیں تو یقیناً بہت مفید ثابت ہوں گی۔

ڈاکٹر سید عبداللطیف نے اس تحریک کو جس اہتمام کے ساتھ پیش کیا ہے اس کا پورا حال اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے، اس لئے میں ان حضرات سے جو اس مسئلہ میں دلچسپی رکھتے ہیں، درخواست کروں گا کہ وہ ضرور اس کا مطالعہ کریں اور اکاڈیمی کے اس عظیم مقصد کی کامیابی میں اس کی پوری مدد کریں یہ رسالہ ۱۲ر میں اکاڈیمی کے دفتر سے مل سکتا ہے۔

نقوش شخصیات نمبر خاص نمبر نکالنے میں لاہور کے رسالوں کو بڑا ملکہ حاصل ہے اور تاجرانہ مسابقت کی وجہ سے بعض رسایل بڑا اہتمام کرتے ہیں انھیں میں سے ایک ادارۂ فروغ اُردو ہے جس نے سالنامہ ۵۵ء (شخصیات نمبر) غیر معمولی اہتمام کے ساتھ شایع کیا ہے جو ۸۲ حاضر و غائب مشاہیر علم و ادب کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔ اس انجمن میں شاعر، ادیب، مورخ، عالم، فسانہ نگار، ڈرامہ نویس، بوڑھے، جوان، مرد و عورت سبھی شامل ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ تذکرے انھیں حضرات سے لکھوائے گئے ہیں جنھوں نے صاحب تذکرہ کا مطالعہ زیادہ قریب سے کیا ہے۔ ادارۂ فروغ اُردو اس سے قبل اچھے اچھے خصوص نمبر شایع کر چکا ہے، لیکن یہ سالنامہ اپنی افادیت کے لحاظ سے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، کیونکہ اس کا تعلق حال سے اتنا نہیں جتنا مستقبل سے ہے اور مستقبل جتنا آگے بڑھتا جائے گا اس کی قدر و قیمت میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا جائے گا۔

یہ سالنامہ تذکروں کی فہرست میں ایک بڑا مفید اضافہ ہے اور سات سو صفحات میں ایجاز و اختصار کے ساتھ اس نے گویا سات سو کتابوں کی بنیاد ڈالدی ہے ـــ کاغذ، طباعت، کتابت وغیرہ بھی نہایت پاکیزہ ہے اور چھ روپیہ قیمت بھی زیادہ نہیں ہے۔

سالنامہ سویرا سویرا لاہور کی ترقی یافتہ رسالہ ہے اور نہایت نفاست و سلیقہ کے ساتھ نکل رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے بھی ایک خاص نمبر شایع کیا ہے جو کسی خاص موضوع سے تو تعلق نہیں رکھتا لیکن مضامین کے تنوع کے لحاظ سے وہ ادب اور آرٹ کا بڑا اچھا مجموعہ ہے جس میں علمی و انتقادی مقالات، افسانے، ناولٹ، غزلیں، نظمیں اور تصویریں سبھی کچھ موجود ہے ـــ قرۃ العین حیدر کا ناولٹ بڑا اچھا جزئیاتی مطالعہ ہے۔ مضامین کے سلسلہ میں پروفیسر احتشام، حسن عسکری اور ڈاکٹر محمد حسن کے مقالے خصوصیت کے ساتھ بڑے ادب آموز ہیں۔ افسانوں میں حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کے افسانے خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ غزلوں کا حصہ زرا کمزور ہے۔ ضخامت ۲۵۴ صفحات۔ قیمت تین روپیہ۔

سالنامہ شاہراہ شاہراہ، دہلی کا مشہور و مقبول ماہنامہ ہے اور ترقی پسند ادب کا بڑا حامی۔ اس کے اڈیٹر جناب ظ۔ انصاری بڑے حوصلہ کے انسان ہیں اور رسالہ کی ترتیب میں نہایت محنت و کاوش سے کام لیتے ہیں۔ وہ بڑے خوش ذوق نقاد بھی ہیں اور باوجود "غزل دشمنی" کے بھی ایسی نظموں کی اشاعت سے احتراز نہیں کرتے جن کی ٹکنک غزل سے جدا نہیں ہوتی ـــ حال ہی میں اس کا سالنامہ بھی شایع ہوا ہے جو ۲۵۰ صفحات کو محیط ہے اور گوناگوں دلچسپیوں سے معمور۔ ادبی مباحث کے سلسلہ میں جتنے مضامین درج ہیں ان سے ہمیں ترقی پسند ادب کے موجودہ رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، کہانیاں بھی سب اچھی ہیں اور مضامین میں باقر مہدی کا "ادب اور تاریخی شعور" خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ نظم کے حصہ میں شفیق فاطمہ کا نذرانہ بڑی فکر انگیز نظم ہے۔ چار صفحات تصاویر کے بھی شامل ہیں۔ قیمت ۴ر۔ ضخامت ۲۵۰ صفحات

اُردو کی نثری داستانیں ڈاکٹر گیان چند کی تصنیف ہے اور اپنے موضوع کے لحاظ سے بالکل پہلی چیز۔ اسوقت تک شعر و شاعری کے باب میں تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور انتقادی حیثیت سے بھی اسی وقت زیادہ توجہ کی گئی، لیکن نثر نگاری کی جانب کسی کو توجہ نہیں ہوئی خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنی قیمتی تصنیف سے اس عدم توجہی کی کافی تلافی کر دی ـــ یہ کتاب سات ابواب اور تین ضمیموں پر مشتمل ہے اور اُردو نثر کی تاریخ کو داستان گوئی کے آغاز سے لیکر انیسویں صدی تک کی تمام داستانوں پر نہایت شرح و بسط اور تحقیق کاوش کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے ـــ یہ کتاب دراصل وہ مقالہ ہے جس پر مصنف کو الہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی تھی۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کراچی کا ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے کہ اس نے اس مقالہ کو کتابی صورت میں شایع کر کے اُردو تصانیف کی فہرست میں ایک نہایت مفید، دلچسپ اور قیمتی تصنیف کا اضافہ کیا۔ قیمت نو روپیہ آٹھ آنے۔

چند ہدایات

۱۔ دو روپیہ سے کم فرمایش کی تعمیل وی، پی سے نہ کی جائیگی۔
۲۔ دو روپیہ کی فرمائش کی تعمیل پیشگی رقم وصول ہونے پر کی جائے گی۔
۳۔ دس روپیہ سے زائد فرمایش کی تعمیل زر چہارم پیشگی وصول ہونے پر کی جائے گی۔
۴۔ دس روپیہ سے قائد کا مال ریلوے سے روانہ کیا جائیگا۔
۵۔ تمام محصولات ذمہ خریدار ہوں گے۔

جملہ کتابوں کے لئے ہمیں یاد کیجئے۔

مینجر الناظر بک ایجنسی لکھنؤ

مختصر ادبی و تاریخی فہرست کتب

جسمیں

بعض کتابوں کا صرف ایک ایک نسخہ

بھی شامل ہے۔

ادبیات

آبحیات کا تنقیدی مطالعہ مسعود حسن رضوی عہ
احوال غالب مختار الدین آرزو لعہ
اردو غزل ڈاکٹر یوسف حسین عہ
اردو شاعری امیر احمد علوی عہ
اردو کا پہلا ناول نگار اویس احمد ادیب عار
اردو کی عشقیہ شاعری فراق گورکھپوری عار
اکبر نامہ مولانا عبدالماجد دریابادی ہے
انیس کی مرثیہ نگاری اثر لکھنوی عار
بہلد اور اردو شاعری معین الدین عار
بکھری کہانیں کشن پرشاد کول عہ
ترقی پسند ادب سردار جعفری ہے
جدید زبان اردو شوق امرتسری ۶ر
دہلی کا آخری مشاعرہ مرزا فرحت اللہ بیگ عہ
ذکر غالب مالک رام ایم اے عار
ذوق ادب اور شعور احتشام حسین ہے
رقعات غالب مرتبہ شوق امرتسری عہ
ساحل و سمندر احتشام حسین لعہ
سرگزشت غالب مرزا بشیر احمد ۱۲ر
سرسید کے اخلاقی مضامین مرتبہ شوق امرتسری عہ
عود ہندی غالب عہ
علم الحسان سید احمد دہلوی ۶ر
غالب کی شاعری مرزا عسکری ۸ر
غبار خاطر ابوالکلام آزاد ہے
فکر بلیغ شاد عظیم آبادی عار
محاسن کلام غالب عبدالرحمن بجنوری عہ
محاکمہ مرکز اردو سید احمد دہلوی ۸ر
مثنویات امیر احمد علوی عار
مرقع ادب ۲ حصے صفدر مرزا پوری لعہ
مشاطہ سخن ۲ حصے " " لعہ
مطالعہ غالب اثر لکھنوی عہ
موازنہ انیس و دبیر علامہ شبلی لعہ
میر تقی میر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ہے

موازنہ انیس اور شیکسپیر (انگریزی) غلام امام ہے
مقدمہ شعر و شاعری علامہ حالی عار
معرکہ چکبست و شرر ہے
مولانا شبلی کے تاریخی مضامین مرتبہ خوشتر گرامی ہے
" نذیر احمد کے علمی مضامین " عہ
میں ادیب کیسے بنا؟ میکسم گورکی عہ
نادرات غالب آفاق حسین ۴ر
نکات غالب نظامی بدایونی عہ
نظام اردو آرزو لکھنوی عہ
نغمہ فنڈیب عندلیب شاہجہان آبادی ہے
نئے پرانے چراغ آل احمد سرور ہے
ہماری شاعری مسعود حسن رضوی ہے
یادگار انیس امیر احمد علوی عار
یادگار حالی صالحہ عابد حسین لعہ

ادبی تاریخ

اردو کے قدیم شمس اللہ قادری عہ
اردو زبان کی تاریخ واعظ لال عہ
السنہ مشرقیہ محمد شفیع ۱۲ر
تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ عنہ
شعر العجم کامل علامہ شبلی عنہ
عربی ادب کی تاریخ عبدالاحد ہے
مختصر تاریخ ادب اردو اعجاز حسین ۱۲ر

ادبی تذکرے

آب بقا عبدالرؤف عشرت لکھنوی عار
آب حیات محمد حسین آزاد ہے
ادبی قومی تذکرے کشن پرشاد کول ہے
بدیہہ گوئی ہوش بلگرامی عار
تذکرہ الشعراء فارسی دولت شاہ سمرقندی لعہ
سنہ ۵۱ء کا شعری ادب گوپال متل عہ
شعرائے اورنگ آباد سردار علی ۱۲ر
گلشن ہند (نایاب) مرزا علی لطف ہے
ہندو ادیب ناظر کاکوروی عار

ہندو شعرا عبدالرؤف عشرت لکھنوی عہ
یادرفتگان جگر بریلوی لعہ
یورپین شعرائے اردو سردار علی ۱۲ر

ادبی مضامین

ادیب نسواں شوق امرتسری ۱۲ر
انتخاب مخزن مرتبہ شیخ عبدالقادر ہے
باقیات بجنوری (نایاب) عبدالرحمن بجنوری عہ
حاشیۂ فراق گورکھپوری عہ
سنہ ۲۹ء کا بہترین ادب تاباں دیرکاشی پنڈت لعہ
سنہ ۵۰ء کا بہترین ادیب سردار جعفری دیرکاشی عہ
سنہ ۵۱ء کا بہترین ادب " " عہ
زرگل اختر جوناگڈھی عہ
غالب اور اسکی شاعری احمد الدین ۶ر

تنقید

اثر کے تنقیدی مضامین اثر لکھنوی عار
ادبی تبصرے علامہ عبدالحق عہ
ادبی تنقید ڈاکٹر محمد حسن ہے
ادب اور نظریے آل احمد سرور ہے
اردو تنقید کی تاریخ مسیح الزماں ہے
اردو میں تنقید ڈاکٹر محمد احسن فاروقی عار
اردو تنقید پر ایک نظر کلیم الدین ہے
تنقید اور عملی تنقید احتشام حسین ۱۲ر
تنقیدی اشارے " ہے
تنقیدی جائزے " ہے
تنقیدی اصول اور نظریے حامد اللہ افسر عار
تنقید کیا ہے؟ آل احمد سرور ہے
تنقیدی سرمایہ عبدالشکور عار
تنقید جدید اختر اورینوی ہے
تنقیدیں اویس احمد ادیب ہے
تحقیق و تنقید اختر اورینوی ہے
جدید مضامین تنقید آل احمد سرور ہے
چھان بین اثر لکھنوی ہے

داستان انجم اختر حسین خیال عار
سنگ میل اختر حسین رائے پوری عار
مضامین تنقید احتشام حسین ہے
مطالعے اور جائزے راجندر ناتھ شیدا عار
نقد الادب حامد اللہ افسر عار

بلاغت

آئینہ بلاغت مرزا عسکری ہے
بحر الفصاحت نجم الغنی رامپوری ۶ر
تذکرۃ البلاغت ذوالفقار علی عہ
ترجمہ حدائق البلاغت امام بخش صہبائی عہ
مفتاح البلاغت (کمیاب) نجم الغنی رامپوری عار

شرحیں

الشرع فی المجاز شرح دیوان حافظ عہ
بیراہن یوسفی کامل شرح مثنوی مولوی دوم لعہ
شرح کلام غالب آسی لکھنوی ہے
شرح دیوان غالب طباطبائی ہے
شرح دیوان غالب جوش ملسیانی عہ

طنز و مزاح

انکی شوخیاں میری گدگدیاں عبدالغفار عہ
جغرافیہ جدید پنجاب سندباد جہازی عہ
حاجی بغلول سجاد حسین عار
خانصاحب ظریف دہلوی ہے
سنگ و خشت کنھیالال کپور عار [اپنی سوچ میں
شیشہ و تیشہ " عار] آوارہ عہ
مطائبات ماچوری عار
من چلے من چلا عہ
ہدایات (ظریفانہ تعلیم فرقت کاکوروی) لعہ
ناروا (ظریفانہ تذکرہ " ") عار
نورتن (شرح کلام غالب) شوکت تھانوی عار

اقبالیات

اقبال (فنی تشکیل) عزیز احمد ہے
اقبال مجنوں گورکھپوری عہ ۱۲ر

مجموعہ کلام دواوین اور کلیات

آہنگ مجاز لکھنوی للعہ
آیات کمال کمال خلف جلال لکھنوی ۱۲ر
آیات وجدانی یگانہ چنگیزی للعہ
انتخاب گرامی یا بید کمال ۔ عہ
" مثنویات میر سر سلیمان عہ
" غزلیات ذوق " عہ
" زریں مرتبہ سروس مسعود ہے
" جدید (قومی نظمیں) مختلف شعرا عہ
" میر نور الرحمٰن عہ
" نظم اردو انوار عہ
ارمغان حجاز علامہ اقبال ہے
انقلاب دہلی نظامی بدایونی عہ
اندر سبھا امانت۔ امانت لکھنوی مختلف مطابع
ایوان تصور سرور جہانی نائیڈو عہ
بادہ سخن مائل عہ
بال جبریل علامہ اقبال للعہ
بانگ درا " " عہ
باقیات فانی فانی بدایونی ہے
بیاض عشاق نواب بادشاہ محل عہ
بیاض نعت (نعتیہ مجموعہ) حافظ عہ
بیکراں جگن ناتھ آزاد للعہ
پیام مشرق علامہ اقبال للعہ
پیام شباب قاضی نذر الاسلام عہ
پیام اسلام محمود امرد ٹیلی ۱۲ر
تابش خیالی افسر میرٹھی عہ
تجلیات سخن نظامی بدایونی عہ
ترانہ شوق شوق قدوائی عہ
تصویر افکار کیفی حیدر آبادی عہ
تضمین الامثال اصغر شاہجہانپوری عہ
تنظیم الحیات صفی لکھنوی ہے
توزک قیصری کیفی دہلوی عہ
ثنائے حبیب (نعتیہ کلام) بہزاد لکھنوی عہ
جذبات محب محب ہے
جذبات میر میر تقی میر ۲ر
جذبات حریت اقبال حسرت وغیرہ ۲ر
جلوۂ صحیفہ زریں (فارسی) نیر رخشاں عہ
جوئے رواں افسر میرٹھی عہ
جوئے شیر انتظار حسین فلا صہ
جواہر کلیات نظیر سید ہاشمی عہ
حدیث دیگراں خمار بارہ بنکوی عہ
حسن خیال صفدر مرزا پوری عہ
خاور ستان افسر سیمابی صہ
خزینۂ معارف مرتبہ محمد حسین عہ
خمکدہ آزاد محمد حسین آزاد عہ
خمستان کیفی کیفی دہلوی عہ
خواب گراں مرتبہ صفت برنی عہ
خوبی سخن کمال خلف جلال عہ
خیابان خلیل خلیل عہ
دل و جان تسلیم لکھنوی عہ
دنیائے راز راز چاندپوری عہ
دولرانی خضر خاں (امیر خسرو) ہے
دور جدید مرتبہ سنجاد دہلوی عہ

نایاب دواوین

دیوان گویا عہ
" انور صہ
" حیدر عہ
" خورشید عہ
" سرود نعتیہ ہے
" عزیز عہ
" واکب عہ
" ہاجد دہلوی ہے
" شوق قدوائی صہ
" فغانی ہے
" اثر دہلوی عہ
" طوسی عہ
" واقف لاہوری ہے
دیوان شاہ تراب ہے
" لطیف عہ
" افضل عہ
" بہجت عہ
" وفروغ عہ
" ولایت عہ
" صفیر عہ
" بشیر دہلوی عہ
" ولی دکھنی عہ
" گرامی ہے
" تاباں دہلوی عہ
" شیدا (جمیل خاں) للعہ
(مطبوعہ جرمنی) نہایۃ اکمال حسرت دہلی
دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد ہے
" غالب مع شرح نظامی بدایونی ہے
" غالب مع فرہنگ " " عہ
دیوان روشن بدایونی عہ
" ذوق عہ
" میر درد عہ
" صفی لکھنوی عہ
دیوان حافظ انجمن عہ
" ظفر یاکڑ ایڈیشن عہ
" داغ عہ
" غالب مصور ہے

دیوان میر حسن عہ
" رضا بنگلی ملی عہ
" خفیظ (مخمسہ نول) عہ
" جانصاحب ہے
" امیر مینائی ہے
" فصاحت لکھنوی ہے
رباعیات عمر خیام عہ
" شاد عظیم آبادی للعہ
راہ حق شاد عظیم آبادی عہ
رباعیات گرامی گرامی للعہ
رباعیات ابو سعید ابو الخیر ۱۲ر
رنگ زمانہ محب دریابادی عہ
رنگ محل ساغر نظامی ہے
روح کلام غالب مرزا اسہا عہ
ریاض لطافت (نایاب) شعر
ریاض باسط (نکیاب) ۱۲ر
زمزمہ حیات سراج الدین ظفر عہ
زاندان حماقت احمق پھپھوندوی عہ
سبد گل شاعر لکھنوی عہ
ستارہ محمدی مختلف شعرا عہ
سیچے موتی محمدی بیگم عہ
سرمایہ تشکین (نکیاب) عہ
سفینہ تشفیق جونپوری عہ
سکندر نامہ امیر خسرو عہ
سنگ دشت احمق پھپھوندوی للعہ
شاعر کی راتیں جوش ملیح آبادی عہ
شاہنامہ اسلام ۲ جلد حفیظ جالندھری شعر
شعرستان محمود اعظم فہمی عہ
شعلہ طور جگر مراد آبادی صہ
غنچہ نور بسمل عہ
فردوس جذبی ہے
قصائد ذوق مرتبہ سید ہاشم عہ
" ذوق (نکیاب) عہ
کلیات سودا ہے
" ذوق (نایاب) ۱۲ر
" دفا امپوری عہ
" اکبر اول صہ
" اکبر سوم للعہ
کلیات شادان صہ
" آتش ہے
" اقبال (اسعد) صہ
" نظیر اکبر آبادی ۱۲ر
" یگانہ موہانی عہ
کلیات بحری صہ
کلیات رعب للعہ
کلام کیفی کیفی حیدر آبادی عہ
گفتار بیخود (دہلوی) (نکیاب) للعہ
گلستان رشید (غزلیات) رشید عہ
گلشن اکبر الہ آبادی (نکیاب) ۱۲ر
گلدستہ یوسفی قدیم شعرا کا منتخبہ کلام عہ
گلبانگ میر ولی اللہ ہے
گلبانگ حرم (نعتیہ مجموعہ) حمید صدیقی ہے
گنجینہ جوہر مولانا محمد علی جوہر عہ
گنج پنہاں اکبر الہ آبادی عہ
گیتان جلی ٹیگور عہ
مثنوی عالم نواب بادشاہ محل عہ
مثنوی مولانا روم کامل (فارسی) عشرہ
واقعات کربلا مرتبہ منظور علی علوی عہ

مراثی

مراثی انیس ۳ جلد (نکیاب) ۲۱ر عشرہ
افکار تعشق اول تعشق عہ
افکار تعشق دوم " عہ
افکار محن واجد علی شاہ وغیرہ عہ
آثار عشق عشق عہ
اسرار محن ذکی وغیرہ عہ
شعار دبیر دبیر عہ
گلزار رشید پیارے صاحب رشید عہ
معیار کامل کامل عہ
نگار نفیس نفیس عہ
مراثی نگار نگار ہے
وقار انیس ۲ حصے انیس للعہ
انیس و دبیر کے پانچ نادر مرثیے عہ

گھر بیٹھے شاعری سیکھئے

شاعری کی چار کتابیں مولانہ عشرت لکھنوی
جس میں شعر گوئی کے جملہ قواعد اور جملہ اصناف
شاعری میں شعر کہنے کے طریقے نہایت سہل زبان
میں تلاش کر کے ہیں۔ قیمت عمدہ سیاہی سوا دو روپیہ عہ

آپ ادیب بننا چاہتے ہیں تو....

اصول اردو عشرت ۶ر قواعد میر عشرت ۸ر
اصلاح زبان " ۶ر مضمون نویسی ۸ر
نیان و بیان " ۶ر قواعد التخلص جلال ۸ر
نظام اردو آگرہ

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

انتخاب کلام اقبال مع تشریح و حواشی و فرہنگ ۱۲-۰ مرتبہ محمد عبد اللہ قریشی ایم اے

ناولیں

نسیم حجازی
یوسف بن تاشفین ۲ ج
آخری چٹان ۲ ج
طاستان مجاہد ۲ ج
آخری معرکہ ۲ ج
شاہین ۲ ج
محمد بن قاسم ۲ ج

اے۔ آر۔ خاتون
افشاں ۲ ج
شمع ۲ ج
تصویر ۲ ج

فیاض علی
انور ۲ ج
شمیم ۲ ج

رئیس احمد جعفری
اندھا ۲ ج
جواری ۲ ج
طوفان ۲ ج
سیما ۲ ج
دل ۲ ج
عورت ۲ ج
چاندنی ۲ ج
دوست ۲ ج

رشید اختر ندوی
اس نے محبت کی ۲ ج
گل رخ ۲ ج

قیسی رامپوری
تحسین ۲ ج
انجم ۲ ج
کیفستان ۲ ج
شیرین ۲ ج
برہنہ ۲ ج
خیانت ۲ ج

شوکت تھانوی
جوڑ توڑ ۲ ج
سسرال ۲ ج

عزالہ ۲ ج
سپنے ۲ ج
خدا نخواستہ ۲ ج
انشاء اللہ ۲ ج
دنیائے تبسم ۲ ج
بڑ بھس ۲ ج
عمہ خاتون ۲ ج
شیطان کی ڈاڑی ۲ ج
برق تبسم ۲ ج
مسکراہٹیں ۲ ج
گرگٹ ۲ ج
مونڈی کاٹے ۲ ج
بقراط ۲ ج
بکواس ۲ ج

نسیم انہونوی
مہ پارہ (ایتناول) ۲ ج
نجم السحر ۲ ج
خروش انتقام ۲ ج
نشاط ۲ ج
کہکشاں ۲ ج
خنگفتہ ۲ ج
طرز زندگی ۲ ج
شبنم ۲ ج
آخری کمانی ۲ ج
شوہر کا روگ ۲ ج

احسن فاروقی
زلیخا ۲ ج
شام اودھ ۲ ج
خوجی ۲ ج

حجاب امتیاز علی
اندھیرا خواب ۲ ج
ظالم محبت ۲ ج

مولانا صادق سرھندی
فتح مصر ۲ ج
شگدل بکھ ۲ ج
طارق ۲ ج
سلطان صلاح الدین ۲ ج
جانباز ترک ۲ ج
افروقیہ کی دولہن ۲ ج

نازنین عرب ۲ ج
حور امراتش ۲ ج
نقاب پوش پیغمبر ۲ ج
سسلی کی ساحرہ ۲ ج
شریف مجاہد ۲ ج
شیر سوڈان ۲ ج
فتح شوستر ۲ ج
خلیفہ اعظم ۲ ج
عروس بغداد ۲ ج
عجیب جنگ ۲ ج
محبوبہ اودھ خاں ۲ ج
معرکہ کربلا ۲ ج
آفتاب عالم کامل ۲ ج
اندلس کی دو چاند ۲ ج
بہادر و شیزہ ۲ ج
جوش اسلام ۲ ج
خروش انتقام ۲ ج
عربی دو شیزہ ۲ ج
ماہ طلعت ۲ ج
مرزا عظیم بیگ چغتائی
خانم ۲ ج
شریر بیوی ۲ ج
فل پوٹ ۲ ج
لفٹیننٹ ۲ ج
چینی کی انگوٹھی ۲ ج
خطوط کی تم ظریفی ۲ ج
جنت کا بھوت ۲ ج
فرزند سرحد ۲ ج
خان محبوب طرزی
حور اندلس ۲ ج
حلقہ نور ۲ ج

مولانا صادق سرھنوی
قیامت صغریٰ ہے
پانچ ہزار سال قبل ۲ ج
فولادی پنجے ۲ ج
عالم امکان ۲ ج
گورکھ دھندا ۲ ج
سپیرا ۲ ج
ترپائی ۲ ج

نظیر بیگم ۲ ج
گیتی آراء ۱۲ ج
واہ ۲ ج
مکافات عمل ۲ ج
میری کہانی ۲ ج
پارہ دل ۲ ج
اسرار امرتسر ۱۲ ج

سجاد حسین
دھوکا ۲ ج
حاجی بغلول ۲ ج

مرزا رسوا بی۔ اے
امراؤ جان ادا ۲ ج
بہرام کی رہائی ۲ ج
شریف زادہ ۲ ج

ڈپٹی نذیر احمد
شعلہ ۲ ج
نات العش ۲ ج
توبتہ النصوح ۲ ج
مراۃ العروس ۲ ج
موہن لال فہم
بزم اکبری کا قتل ۲ ج
بلاس کماری ۲ ج
خاتون اودھ ۲ ج
عائشہ بیگم ۲ ج
فریب حسن ۲ ج

تیرتھ رام فیروز پوری
آزادی ۲ ج
آرسین لوپن جاسوس ۲ ج
انمول ہیرا ۲ ج
ڈاکٹر نکولا ۲ ج
سبستان ۲ ج
سنہری پنجھو ۲ ج
قاتل ہار ۲ ج
مصنوعی انسان ۲ ج
نقلی نواب ۲ ج
مہر خموشی ۲ ج
نازک کٹار ۲ ج
شہید ۲ ج
گردش دوراں ۲ ج

سیگی ۲ ج
زبیدہ ۲ ج
سفر زہرہ ۲ ج
صبح اندلس ۲ ج
اڑن طشتری ۲ ج

عبدالحلیم شرر
حبیب حق کامل ۲ ج
حسن انجلینا ۱۲ ج
ملک العزیز ورجینا ۲ ج
منصور موہنا ۲ ج
حسن بن صباح ۲ ج
رتن ناتھ سرشار
فسانہ آزاد کامل ۲ ج
خدائی فوجدار ۲ ج
سیر کہسار ۲ ج
الف لیلیٰ (بطرز ناول) ۲ ج

احمد حسین خاں
درد ۲ ج
سرخ حرف ۲ ج
عورت جس نے گرد کھایا ۲ ج
پری بانو ۲ ج
کوہ شعلہ ۱۲ ج

شاہی خزانہ ہے ۲ ج
خونی ہیرا ۲ ج
خونی چکر ۲ ج
لنگوٹہ جاسوس ۲ ج
تلافی گناہ ہے
انجام ہوس ۲ ج
بڑا بھائی ۲ ج
دیوتا کی آنکھ ۲ ج
خونی شیطان ۲ ج
دست قضا ہے
سرفروش ۲ ج
سرلے والی ہے ۲ ج
فرشتہ انتقام ہے ۲ ج
پامال ستم ۲ ج
زہر ہلاہل ۲ ج
شامت اعمال ۲ ج

ریاض الدین
خونی دولہن ہے ۲ ج
کرنی کا پھل ۲ ج
ویران محل ہے ۲ ج
اسیر بلا ہے ۲ ج
قاتل کی بیٹی ۲ ج
مجرم ہے ۲ ج
میری تقدیر ۲ ج
تہ خانہ کا راز ہے ۲ ج
دغا کا پتلہ ہے ۲ ج
للتا ہے ۲ ج
کرنی کا پھل ۲ ج
مقدس جوتا ہے ۲ ج
نیا آدمی ۲ ج
آبرو ۲ ج
تلاش اکسیر ہے ۲ ج
جنجر بیداد ۲ ج
انصاف ہے ۲ ج
مطلبی دنیا ۲ ج

شیوڑائن شیم
چاند ۲ ج
شانتی بادا ۲ ج
دوار کا پرشاد اتق
جغادفا ۲ ج

کرشمہ تقدیر ۲ ج
نیرنگ فرنگ ۲ ج
شیورت لال ورمن
شاہی ڈاکو ۲ ج
شاہی بھکاری ۲ ج
شاہی بھکتنی ۲ ج
جوالا پرشاد برق
بنکالی دلہن ۲ ج
پرتاب ۲ ج
روہنی ۲ ج
مار آستین ۲ ج
مار نامنی ۲ ج

حکیم محمد علی خاں
اختر و حسینہ کامل ۲ ج
عبرت کامل ۲ ج

ریاض الدین
کرنی کا پھل ۲ ج
سنہری ٹوٹلی ۲ ج
مائل ملیح آبادی
پاسبان سے
تیزک طرخاں ہے
ہجرت ہے
کعبہ سے کربلا تک ہے
مرگ یزید ۲ ج
زیتون ہے
یہ زندگی کے میلے ۲ ج
سکھ ۲ ج
پرتاب ۲ ج
تلاش اکسیر ہے ۲ ج
بازار ہے
تیسری منزل ہے
حکیم لاریب
کفن پوش ۲ ج
پراسرار فقیر ۲ ج
پراسرار ہاتھ ۲ ج
وہی دہانوی
رخسانہ ۲ ج
تگڈم ۲ ج

بھنور ۲ ج
دلدل ۲ ج
شرمناک فسانے ۲ ج

مظہر الدین
سندھ کی راجکماری ہے ۲ ج
شیر دل خاتون ۲ ج
بدنام رفیعی

چنام کے اسرار ۲ ج
داستان ۲ ج
مجرم کون؟ ۲ ج
نادم سیتاپوری
محل سرا ہے
شکار ۲ ج
تیرہ کتب اطفال ۲ ج

پریم چند
غبن ۲ ج
میدان عمل ہے
کرشن چندر
جب کھیت جاگے ۲ ج
فتحت ہے

افسانے

پریم چند
فردوس خیال ہے
واردات ۲ ج
آخری تحفہ ۱۲ ج
زاد راہ ہے
کرشن چندر
پرانے خدا ۲ ج
نئے افسانے ۲ ج
بلونت سنگھ
ہندوستان ہمارا ہے
سنہرا دیس ہے
صدیقہ بیگم
پلکوں میں آنسو ہے
دودھ اور خون ہے

ملنے کا پتہ
الناظر بک ایجنسی
لکھنؤ

ناولوں کے ناول دنیا کے سب سے بڑے جاسوس کی یادگار سنسنی خیز کارنامے
سرورجاوید کے قلم سے نوٹ کیجئے آرڈر ابھی بھیجئے سلطان بک ڈپو آتش خاموش صاحب عابد حسین ۲۰۰

تاریخ

آئینہ تاریخ نما (کمیاب) شیو پرشاد عہ
آج سے قبل کا ہندوستان ڈاکٹر سید محمود عہ
ارمغان اسرائیل منظور الدین عہ
اسلامی شاہنامہ محمد ابراہیم عہ
اسلامی خلافت کا کارنامہ موسیٰ خاں عہ
اسلامی معاشرت اندلس میں زاہدہ خاتون عہ
اشرف التواریخ ۲ حصے شاہ محمد اکبر ۱۵ھ
اظہار الشہادتین محمد جہانگیر عہ
اقصائے مغرب (تاریخ افریقہ) نایاب صہ
اقوام ترکی احمد دین للعہ
انقلاب ۱۸۵۷ء کا دوسرا رخ حسام الدین عہ
انقلاب فرانس باری عہ
ایک ترک کا روزنامچہ خالد خلیل بے عہ
بابل سردار خاں نشاط ۸ر
بزم آخر فیاض الدین عہ
بغداد عباد اللہ اختر عہ
بوڑوں کا کچا چٹھا محبوب عالم عہ
تاریخ اسلام کامل حسین الدین ندوی ۱۲ھ
تاریخ اسلام جلد سوم ذکر حسین ۔۔
• برطانیہ (کمیاب) کالیسر عہ
• لاہور (کمیاب) کنہیالال عہ
• مصر جدید (کمیاب) ڈی میکنزی عہ
تاریخ المشاہیر قاضی محمد سلیمان عہ
• ہسپانیہ میرہ کامیکٹ عہ
• ارض مقدس شرر لکھنوی عہ
• فرخ آباد و نوابان بنگش آباد ۔۔
• چین (فارسی) پادری رکسوس صہ
• ستارہ ہند لوطارام عہ
• سلاطین اودھ ۲ حصے سید محمد میرٹھی
• صقلیہ ۲ حصے ریاست علی ندوی عہ
• جیب الہ محمد امیر خاں عہ
• امریکہ راجندری مادھو شرپ صہ
• امریکہ یحییٰ انتہابی اے عہ
• اندور امیر احمد علوی عہ
• اخلاق یورپ ۲ حصے عبد الماجد دریابادی ۔۔
• ہند قدیم کے ایم پانیکار عہ
• دریاباد محب دریابادی ۔۔

تاریخ نجد اسلم جیراجپوری صہ
• خاندان آل عثمان انشاء اللہ خاں ۱۲ھ
• طرز معاشرت ہندو انگلینڈ تراب علی عہ
• ابن خلدون حصہ ۱ احمد حسین بے
• • • حصہ ۲ • • بے
• • • حصہ ۳ • • بے
• • • حصہ ۴ • • للعہ
تاریخ الامت حصہ اول اسلم جیراجپوری عہ
• • حصہ دوم • • عہ
• • ہفتم • • عہ
• تاج محل مصور معین الدین عہ
• پٹیالہ سید محمد حسن ۔۔
• مغربی یورپ یحییٰ تہابی اے ۔۔
• کملا (تذکرہ سلسلہ چشتیہ قادریہ) عہ
• اسلام کامل محی الدین خیاط مصری ۱۲ھ
• جوناگڈھ مصور غلام محمد ۲۵ھ
• مدینہ منورہ غلام دستگیر عہ
• مکہ معظمہ • عہ
• بلاد الجزائر کرنل اسمٰعیل بیگ عہ
• زوال روما مطلب حسین عہ
• تمدن حصہ دوم ہنری ٹامس عہ
• جنگ طرابلس مصور عبد اللطیف ۔۔
• اڑیسہ و بہار اداد حیدر ۔۔
• سندھ (نایاب) شرر لکھنوی صہ
• سلاطین عباسیہ خواجہ حسن نظامی عہ
• افغانستان ۔۔
• ایران قدیم عہ
• مراکش کرنل اسمٰعیل بیگ عہ
• جدید عزیزی ایشیا و یورپ عہ
• دارالسرور خیر پور ابن علی ۱۲ر
• ٹیونس و طرابلس کرنل اسمٰعیل بیگ عہ
• ایران ڈیلو منجن عہ
• پنجاب فیروز الدین عہ
• ہند کے ماخذ عطا حسین للعہ
• یونان عہ
• گجرات سید ابو ظفر ندوی عہ
• گجرات غلام محمد عہ

تاریخ شاہان اسلام شوق ہر تسری عہ
• عدم تعاون پر ایک نظر یونس عہ
• اودھ کامل نجم الغنی (اسپوری) ۱۲ھ
• حیدرآباد دکن • • ۔۔
• مصر ابو الحسن للعہ
تاج و نشان ۲ حصے رفیع عہ
تمدن ہند (نایاب) سید علی بلگرامی سو روپیہ
تمدن عرب (۲) • • پچھتر روپیہ
تبت ابراہیم عجمی ۱۰ر
تصویر کربلا سید آل احمد عہ
ترکی اور اسکا سلطان اطہر عہ
جاپان شیو ریت لال حدمن عہ
جاپان ابراہیم عجمی عہ
جشن فیروزی عباد اللہ اختر ۸ر
چمنستان عرب مصباح الدین عہ
حالات قسطنطنیہ انشاء اللہ خاں ۔۔
• عراق، عرب و عمان ایس ایم ندیم ۔۔
خلافت موحدین نعیم الرحمٰن ۔۔
وادیٔ یرموک کی تاریخ نجم الغنی عہ
دستار و کلاہ رفیع رضوی عہ
دمشق عباد اللہ اختر ۔۔
دنیا کے عجائبات غلام نبی عہ
دنیا کی خفیہ انجمنیں (نایاب) ۲ حصے ۱۵ھ
ذکر فتح اندلس عبد الرحمٰن عہ
راجپوتانہ میں مغل زن و شو کی معاشرت مقبول احمد ۱۲ھ
روم کوٹ شیخ محمد اکرم آئی سی ایس صہ
سڑیہ دادی (تاریخ اسالک ہانسی سے ۔۔
عرب اور انکا مستقبل مقبول احمد عہ
عربوں کا فن تعمیر سید علی بلگرامی عہ
عہد حکومت سلطان عبد الحمید ثانی انشاء اللہ خاں ۔۔
فاطمی دعوت اسلام خواجہ حسن نظامی ۔۔
فتوح الیمن اردو احمد حسین عہ
فتح قسطنطنیہ چیڈوک عہ
فتح قسطنطنیہ بدر الدین عہ
فتوح عبد الحمید خاں وجاہت صدیقی عہ

فسانہ برہما لاجپت رائے عہ
قاموس المشاہیر حصے نظامی بدایونی ۱۵ھ
قدیم ہند کی تہذیب آمد سی دت ۔۔
قدیم ہنرمندان اودھ اسرار حسین عہ
قسطنطنیہ نوازش علی خاں عہ
کارنامہ ترک خلیل احمد ۱۲ھ
کارنامہ راجپوتانہ (نایاب) نجم الغنی ۔۔
کارنامہ لارڈ ہارڈنگ (نایاب) صہ
کنز التاریخ رضی الدین نسبل صہ
گنج شائیگان (تاریخ سکہ جات) عالی صہ
محاربات روس و جاپان فضل حسین عہ
محاربات مصر و سوڈان امیر احمد عہ
• طرابلس آغا رفیق ۔۔
محذرات ۲ حصے شرر لکھنوی للعہ
محذرات تیموریہ ۲ حصے ظہور الحسن للعہ
مرقع سلاطین مصور عبد الغفور ۱۲ھ
مرقع تاجپوشی ۲ حصے امجد علی للعہ
• روس ۱۲ر
مشاہیر امت قاری محمد طیب عہ
مشاہیر مشائخ ہند شفیع الدین عہ
مشاہیر روم جے زائن وما ۱۲ر
• نبی خواہان آدم عہ
• عالم عہ
مشاہیر عالم (طبقہ حکماء) ۔۔
مصر کی کایا پلٹ للعہ
مجموعہ فتوحات واقدی کامل ۱۵ھ
مدارج النبوۃ (فارسی) تاریخ اسلام عہ
مذاہب الاسلام نجم الغنی صہ
مراۃ الکونین صہ
علماء حق ۲ حصے مولانا محمد میاں ۱۲ھ

ایک نادر روزنامچہ

مظہر علی سندیلوی کا ۱۸۵۶ء سے دسمبر ۱۹۱۱ء تک کا روزنامچہ۔ یہ تاریخ کی تاریخ ہے اور داستان کی داستان قیمت عہ۔

ملنے کا پتہ — النّاظر بک ایجنسی — لکھنؤ ہندوستان

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوطِ غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے۔ اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کی روحوں کے ساتھ

(۲) مادیین کا مذہب۔

نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ہادیان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کے لئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی ایسی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے۔ اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آئے ہیں

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول

ڈاک

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان دلنشیں، اس کی نزاکتِ بیان اس کی انشا، عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپے

علاوہ محصول

ڈاک

مذاکراتِ نیاز

یعنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے:- ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اردو غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری۔

قیمت چار روپے

علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ، علاوہ محصول

فراست الید

(مؤلفہ نیاز فتحپوری)

اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات صحت و بیماری، شہرت و نیک نامی پر صحیح پیشین گوئی کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

REGD.N.A 466

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ سمجھنے کیلئے اس کا مطالعہ ضروری ہے

قیمت دو روپے علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۸ء
جنوری، فروری

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زرّین کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی

قیمت دو روپے

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۹ء
جنوری، فروری

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً بیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری فسانہ کیسا ہونا چاہئے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۶ء
فروری، مارچ

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپے

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۱ء
جنوری، فروری

اس سالنامہ کے ڈیڑھ حصے ہیں۔ پہلے حصے میں ارس ہنڈس کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ و اقتباس ہے جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۳ء
جنوری، فروری

(داغ نمبر)

جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رام پور، قیام حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔

سنہ ۱۹۴۳ء
جنوری

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر)

یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لے کر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل ایک تاریخی کتاب ہے۔ جو ہر گھر پڑھے کے پاس ہونا چاہئے

قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر)

جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۲۸ء
سالنامہ

(مومن نمبر) جو چھپا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لئے اس کا پڑھنا ازبس ضروری ہے۔ قیمت ڈیڑھ روپے